رموزِ حیات

پروفیسر سیّد عبدالماجد

رموزِ حیات

از

پروفیسر سیّد عبد الماجد
سابق صدر شعبۂ اُردو، فارسی و عربی لنگٹ سنگھ کالج، مظفرپور (بہار)

و

سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن (اسلامک) بہار

ناشِر

ع - م - ساجد ام اے، ڈپ - ان - ایڈ

تعداد اشاعت ۵۰۰

سال اشاعت

ذی الحجہ ۱۳۸۷ھ - مارچ ۱۹۶۸ء

قیمت :- تین روپے ۵۰ پیسے

ملنے کا پتہ

ہندوستان میں :- کتاب منزل - سبزی باغ - پٹنہ ۴

پاکستان میں :- ۱۰۳ - سی پی اور برار سوسائٹی - کراچی ۵

مطبوعہ

لیبل لیتھو پریس - رمنہ روڈ - پٹنہ ۴

کاتب

سوز داناپوری

انتساب

اپنے منجھلے بھائی

سیّد کاظم حسین مرحوم کے نام

جن کے

ادبی ذوق نے مجھے متاثر اور میرے

شجرِ حیات کو شاداب کیا

تصویر ۱۹۴۹ء



پیدائش ۱۸۹۳ء — ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۱۰ھج

عنوانات

عرضِ ناشر

"رموزِ حیات" مجموعہ ہے پانچ مضامین کا، جن میں چار مطبوعہ ہیں اور ایک (تدبیرِ منزل) غیر مطبوعہ۔

خواب، دسمبر ۱۹۵۵ء، فروری ۱۹۶۰ء اور مئی ۱۹۶۳ء کے ماہنامہ "بُرہان" دہلی میں شائع ہو چکا ہے۔ "خواب" اور "رویائے صادقہ" میں جدید ماہرینِ نفسیات کے نظریات اور اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔

"ہمارا عروج و زوال" اپریل ۱۹۵۳ء کے برہان میں شائع ہو چکا ہے مصنف نے اس مضمون میں مسلمانوں کے عروج و زوال پر تاریخی واقعات کے پس منظر میں اسباب و علل کو سامنے رکھتے ہوئے عالمانہ بحث کی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کے انحطاط کو دور کرنے کی طرف ایک رہنمائی ہے۔

"تصوف" برہان مئی ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس میں لفظ تصوف کے مخرج اور معنی پر محققانہ بحث کی گئی ہے۔

"آسمانی دنیا" برہان کے اپریل ۱۹۶۳ء کے شمارہ میں چھپ چکا ہے۔ سائنس دانوں کی یہ تحقیق کہ چاند اور دوسرے سیاروں پر آبادیاں ہیں اور اس دنیا کی طرح دنیائیں ہیں، جہاں انسان آباد ہیں، سائنس دانوں کی وہاں تک پہنچنے کی کاوشیں اسلامی نقطۂ نظر سے کہاں تک مناسبت رکھتی ہیں۔ قرآن کریم کے اندر اس سے متعلق کیا گیا انکشافات

ہیں۔ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

"تدبیر منزل" غیر مطبوعہ ہے اور ۱۹۶۲ء میں لکھا گیا ہے اس میں حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ ایک پُرسکون اور خوشگوار زندگی بسر کرنے کے لئے کن کن باتوں کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اس کو علم اور تجربہ کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کتاب مسائل زندگی کے متعلق نہایت دلچسپ ہے۔ مصنّف نے اپنے سارے مضامین میں مغربی نظریات کو اسلامی آئینہ میں پیش کیا ہے اور اس طرح ان مضامین میں مغرب و مشرق کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔

اس مجموعہ کی تصنیف و طباعت میں جن حضرات کی معاونت شامل حال رہی ان کا تذکرہ کردینا فرض اولین ہے۔

"آسمانی دنیا" پروفیسر سید شاہ اختر حسین قادری صدر شعبۂ اردو و فارسی بہار یونیورسیٹی (لنگٹ سنگھ کالج) مظفرپور کی تحریک پر قلم بند کیا گیا۔ اور پورا مضمون ان ہی کے سوالوں کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے۔ جو حضرت موصوف نے مصنف کے سامنے پیش کئے تھے۔

میں جناب سید شاہ عطاء الرحمٰن صاحب عطا کاکوی، صدر ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ کا ممنون ہوں کہ انہوں نے کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں اپنے قیمتی مشوروں سے وقتاً فوقتاً نوازہ ہے۔

سید محمد مجتبیٰ صاحب اڈوکیٹ کا سب سے زیادہ احسان مند ہوں کہ انہوں نے پروف پڑھنے میں بڑی مدد کی ہے اور طباعت کے سلسلہ میں ضروری ہدایات سے سرفراز فرمایا ہے۔ جناب عبدالودود ہیڈ مولوی شمس خان مرزا اردو اسکول پٹنہ کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں ان کے مشورے بھی بہت کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔

۳ مارچ ۱۹۶۸ء — ع۔م۔ ساجد

خواب

مئی ۱۹۶۳ء

عالمِ خواب کی دلچسپیاں بیداری سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بعض اوقات بڑھ جاتی ہیں۔ بیداری میں ہم انہیں مناظر کا نظارہ کرتے ہیں، جو ہمارے سامنے موجود ہوتے ہیں اور جب کبھی عالمِ تصوّر کی سیر کرنے لگتے ہیں، تو یہ میدان مشاہدۂ نظری سے زیادہ وسیع ہو جاتا ہے پھر بھی بعض فلسفی قیود اس کو محدود کر دیتے ہیں۔ عالمِ تصور میں ہم کبھی جشنِ ماضی کا مزا لیتے ہیں اور کبھی اپنے مستقبل کی رنگین تصویر اپنی آرزوؤں کی روشنی میں کھینچنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کا دار و مدار بھی اپنے گزشتہ تجربوں پر ہوتا ہے، کیونکہ ہم اپنے صفحۂ تخیل پر کوئی ایسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے ہیں۔ جس سے ہمارا ذہن خالی ہو، یہ ہوتا ہے کہ ایک قسم کی بیل پر دوسرے قسم کے بوٹے لگا کر ایک نیا گلدستہ بنا لیتے ہیں، لیکن اس جوڑ توڑ کے لئے بھی موقع محل، تناسب، وضع قطع حسن و قبح کی رعایت لازمی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ امکانِ عقلی کی

سنا کے بغیر کوئی نقشہ قبول خاطر نہیں ہوتا۔ اگر ہم چاہیں کہ ایک ایسے باغ کا تصوّر کریں، جو محض ہوا پر معلق ہو تو قوتِ متخیلہ تھوڑی کاوش کے بعد عاجز ہو کر رہ جائے گی، کیوں کہ جب کسی درخت کا تصور ذہن میں آتا ہے، تو فوراً ایسی زمین نظر آنے لگتی ہے۔ جس سے اس کی جڑ کا تعلق ہو۔ کیونکہ عقلِ انسانی اسی کی عادی ہے اور جب آپ کسی ایسے درخت کا تصور کرنے لگیں، جس کو کسی زمین سے تعلق نہ ہو، تو یہ نقشہ نہیں جمتا، برخلاف اس کے عالمِ خواب تمام عقلی قیود سے آزاد ہے اور ہر فلسفی پابندی سے بری، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک آن اور ایک مکان میں متضاد نقشے دیکھتے ہیں، کبھی تاریکی دیکھتے ہیں اور اسی تاریکی میں آفتاب کا تصور بھی آجاتا ہے۔ کبھی آگ دیکھتے ہیں اور اسی سے بالکل متصل بہتا ہوا چشمہ نظر آتا ہے۔ ایک مردہ دیکھتے ہیں اور پھر اسی سے گفتگو ہونے لگتی ہے۔ سوال و جواب ہوتا ہے۔ قبر دیکھتے ہیں اور اس میں دلکش چمن کا نظارہ آتا ہے۔ بھلا کہئے خواب کی یہ دلچسپیاں کس قدر بڑھی چڑھی ہیں۔ آپ نے کبھی غور فرمایا ہے کہ ہمارے یہ خواب کیا ہیں اور ہماری روزمرہ کی زندگی میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ ہم دانستہ یا نادانستہ اس سے کیا فائدے حاصل کرتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ خواب کے مختلف پہلو آپ کو دکھاؤں!

خواب صداقت اور کذب کے لحاظ سے تین قسم کے ہوتے ہیں، (۱) نفسانی

(۲) روحانی (۳) رحمانی پہلی قسم کا تعلق فلسفۂ نفسیات سے ہے، دوسری کا روحانیات (SPIRITUALISM) سے اور تیسری کا الٰہیات (DIVINITY) سے ہماری عقلیں اکثر ان چیزوں کے سمجھنے سے قاصر رہتی ہیں، جو طبیعات (METAPHY-SICS) سے بالا ہیں، ہمارا استدلال، ہماری تحقیق، ہمارا قیاس زیادہ تر ہمارے طبعی تجربات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے میں پہلے خواب کے ان نظریات کو پیش کرنا چاہتا ہوں، جن کا تعلق طبیعات اور نفسیات سے ہے۔ مسٹر فرائڈ کا تو دعویٰ ہے کہ خواب کا تعلق محض نفسیات ہی سے ہے اور اس کا روحانیات اور الٰہیات سے کوئی واسطہ نہیں، میں ان کے اس خیال کو ان کی عدم واقفیت پر محمول کرتا ہوں کیونکہ یہ فلسفۂ نفسیات کے ماہر تو بیشک ہیں۔ لیکن ان کی روحانی اور مذہبی واقفیت بہت محدود ہے، میں نے اپنے رسالہ رویائے صادقہ (PROPHETIC DREAM) میں ان کے بعض ایسے نظریات پر جو انہوں نے اپنی کتاب "تعبیرات خواب" (INTERPRATATION OF DREAM) میں رویائے صادقہ کے خلاف قائم کئے ہیں۔ ایک بسیط بحث کی ہے اور تجربات سے استدلال کرتے ہوئے سو سے زیادہ ایسے خواب درج کئے ہیں کہ جن کی صداقت ثابت ہو چکی ہے۔ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں کہ یہ مختلف فیہ بحث چھیڑی جائے۔ میں خواب کے نفسیاتی نظریات کو مانتے ہوئے رویائے صادقہ کا بھی قائل ہوں، جس کو بالاختصار پیش کروں گا۔

انسان کی نظر کے سامنے سے جتنی چیزیں گذرتی ہیں۔ اس کی تصویریں صفحاتِ خیال پر آجاتی ہیں اور فطرتاً ایک سینما کا سا مسلسل فلم تیار ہو جاتا ہے‘ یہی سبب ہے کہ جب کبھی ہم کسی گذشتہ واقعات کو یاد کرتے ہیں‘ تو ایک مسلسل نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ جس طرح کسی کتاب سے کسی خاص مضمون کو نکالنے سے پہلے فہرست مضامین پر نظر دوڑانی ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی گذشتہ واقعہ سے اپنے حافظہ کا رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہم جلد جلد کتابِ خیال کی ورق گردانی کر جاتے ہیں‘ ہمیں اپنے حافظہ سے کام لینے میں ایک رابطہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی لئے وہ واقعہ جلد یاد آتا ہے جس کی مشابہت ہمیں خارج میں نظر آتی ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ اگر کسی شخص کو کسی سفر میں ایک تنہائی کے مقام پر کوئی بھیانک شکل نظر آگئی، تو اس واقعہ کا اعادہ ہر اس موقع پر ہو جاتا ہے جب کسی سفر میں تنہائی کا موقع آجاتا ہے‘ یا جب کوئی کریہہ منظر تصویر نظر سے گذرتی ہے‘ یا جب کبھی کسی اور وجہ سے خوف زدہ ہو جاتا ہے‘ کیونکہ سفر کی تنہائی، کسی تصویر کا کریہہ منظر ہونا، خوف کا طاری ہو جانا۔ الگ الگ اس واقعہ کی کیفیتوں سے مشابہ ہیں۔ جس واقعہ کی مشابہت جلد تصویر میں نہیں آتی۔ اس کے یاد کرنے میں دقت ہوتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان اس کے اعادہ سے مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی کیفیت کو نسیان کہتے ہیں۔ ہر انسان کے دماغ میں کچھ ایسے نقشے موجود ہیں کہ جن کا اکثر اعادہ ہوتا رہتا ہے‘ بعض ایسے نقشے ہیں۔

جن کو غور و فکر کے بعد تصور میں لانا ممکن ہے اور بعض نقشے ایسے ہیں، جو عالمِ نسیان کے ایسی تاریک تہہ میں پڑے ہیں کہ جن کا اعادہ ناممکن ہے۔

انسان کا دماغ کبھی معطّل نہیں رہتا، اکثر حواس خمسہ کے محسوسات سے متاثر ہو کر دماغ اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور کبھی تو ان محسوسات کو اپنا کھلونا بنا کر اس سے کھیلتا رہتا ہے اور مزے لیتا رہتا ہے اور کبھی ان سے مقابلہ کرتا ہے۔ جس کے اثر سے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور اس اشتعال کا نتیجہ کبھی راحت کبھی رنج ہوتا ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا کہ دماغ معطل اور نچلا ہو کر سکون حاصل کرے۔ دماغ اور دل کی حرکت ایک ہی وقت رکتی ہے اور اسی کو موت کہتے ہیں۔ ورنہ خواب میں، غشی میں، سکتے میں، ہر حالت میں دل و دماغ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات ایک زندہ شخص کے قلب کی حرکت محسوس نہ ہو سکے‘ یا اس کے شغلِ دماغ کا اثر حواس خارجی پر نہ پڑ سکے۔

خواب حواس خارجی کے معطل ہونے کو کہتے ہیں‘ یعنی جب انسان دیکھنے، سننے، چھونے، سونگھنے اور چکھنے کی مشغولیتوں سے علیحدہ ہو کر پڑ جاتا ہے‘ تو اس حالت کو خواب کہتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ تمام حواس خمسہ کی طاقت زائل ہو جاتی ہے۔ بلکہ یوں سمجھنا چاہیئے کہ ان کا رابطہ خارجی ماحول سے باطن کی طرف منتقل ہو جاتا ہے‘ اس کا طبعی فائدہ یہ ہوتا ہے کہ طبیعت یکسو ہو کر قویٰ بدنی کی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور

بدلِ ما یتحلل ہونے لگتا ہے۔

دماغی تشاغل میں سب سے زیادہ قوتِ ممیّزہ کام کرتی ہے، کیونکہ ایک چیز سے دوسری چیز کا امتیاز کر کے اس پر کسی کیفیت یا حال کا حکم اثباتی یا انکاری صادر کرتی ہے، یہ مسلّم ہے کہ بیداری کے لئے تمیز لازمی شئے ہے۔ اس لئے قوتِ ممیّزہ تھک کر حالتِ خواب میں معطل ہو جاتی ہے اور اس کے معطل ہونے سے قوتِ حافظہ اور مدرکہ بھی بے کار ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ دماغ اپنی مشغولیت کے لئے متخیلہ کی مختلف تصویریں اُلٹ پھیر کر مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ بغیر کسی امتیاز کے مختلف تصویریں سامنے آنے لگتی ہیں اور روح حیوانی اس کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، اکثر اتفاقی طور سے مسلسل نقشے کسی گذشتہ واقعہ کے پیش آتے ہیں جو تسلسل اور تناسب کی وجہ سے حافظہ پر منقش ہو جاتے ہیں اور بیداری کے بعد یاد آتے ہیں، اب اگر وہ گذشتہ واقعے عالمِ بیداری میں لائقِ اعادہ تھے، یعنی اس کو وہ شخص یاد کر سکتا تھا، تو یاد آجاتا ہے کہ یہ واقعہ فلاں مقام اور فلاں زمانہ کا تھا۔ لیکن جب وہ ایسے نقشے ہوتے ہیں، جو نسیان کی تہہ میں بیٹھ چکے ہیں، تو انسان اس کو ایک نیا منظر سمجھنے لگتا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی ماہرِ نفسیات اس کی تحلیلِ نفسی کرنے لگے، تو بہت ممکن ہے کہ یہ پتہ چل جائے کہ خواب کا وہ نقشہ بیداری کے کسی گذشتہ واقعہ کی تصویر ہے۔ مگر سرسری نظر میں وہ نیا نقشہ معلوم ہوتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نقشے مسلسل نہیں ہوتے ہیں، بلکہ غیر مسلسل ایسی حالت میں اس کا رابطہ گذشتہ واقعہ سے پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے احمد نے کبھی محمود کے ساتھ چمن کی سیر کی تھی اور اثنائے سیر میں ایک گلاب پر ایک بلبل کو دیکھا کہ گرد گھوم گھوم کر نغمہ سرائی کر رہی ہے اور کسی دوسرے موقع پر یہ واقعہ گذرا تھا کہ احمد ایک ہاتھی پر سوار ہے اور ایک شیر کا شکار کرنے کا تہیّہ کر رہا ہے، اب دونوں واقعے کبھی اس طرح مختلط ہو جاتے ہیں کہ ایک تصویر دوسرے منظر کی دوسری تصویر سے متصل نظر آتی ہے اور بعض کا نقشہ ذہن سے غائب ہو جاتا ہے۔ اب وہ دیکھتا ہے کہ ایک باغ میں محمود گلاب کے پودے کے سامنے کھڑا ہے۔ احمد اس کو تیر مارنے کا تہیّہ کر رہا ہے اور پھر محمود بلبل بن کر پرواز کرنے لگتا ہے اور ایک ہاتھی پر شیر سوار ہے، محمود اس کے کان کے پاس احمد کی شکایت کرتا ہے اور احمد کے خلاف اس کو اُبھارتا ہے۔ اگرچہ یہ خواب دو گذشتہ واقعوں کا مجموعہ ہے لیکن اختلاط کی صورت نے نیا نقشہ بنا دیا ہے جس کے بعض جزو عقلِ انسانی کے خلاف ہیں۔ لیکن چونکہ قوتِ ممیّزہ کام نہیں کر رہی ہے اور مدرکہ بھی معطل ہے۔ اس لئے محالات کا استحالہ ظاہر نہیں ہوتا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ عالمِ خواب میں وہ نقشہ آجاتا ہے، جو بالکل نیا ہوتا ہے اور انسان یہ سمجھتا ہے۔ میں نے کبھی ایسی شکل دیکھی نہیں، حالانکہ وہ کسی

ایسی حالت میں دیکھ چکا ہے کہ جس وقت اس نے اس کی طرف مطلق توجہ نہ کی تھی اور اس کی وجہ سے وہ یاد نہ آسکا اور نہ اس کا اعادہ ممکن تھا، جیسے ہم کبھی کسی بڑے شہر کی سیر کرتے ہیں۔ بازار میں مختلف سائن بورڈ نظر آتے ہیں، ہم بغیر کسی توجہ کے اس کو محض سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے گزر جاتے اور کبھی خواب میں دیکھتے ہیں۔ کیونکہ متخیلہ کے فلم پر ہر اس چیز کی تصویر آجاتی ہے، جو نظر کے سامنے گزرتی ہے، اب دیکھنے والا جب یہ خواب میں دیکھتا ہے کہ وہ بھٹا چاریا اینڈ کو کے سامنے کھڑا ہو کر کوئی دوا مانگ رہا ہے، تو اس کو تعجب ہوتا ہے کہ بھٹا چاریا اینڈ کو نقشہ اس کے ذہن میں کیوں کر آگیا۔ حالانکہ یہ اس کے متخیلہ کا محفوظ سرمایہ تھا۔ اس طرح خواب میں انسان اکثر بھولی بھالی باتیں دیکھ لیتا ہے۔ جس کا بیداری میں یاد کرنا محال ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بیداری کے تصور کے لئے رابطہ اور تسلسل لازم ہے۔ برخلاف اس کے خواب میں اکثر بے ربط اور غیر مسلسل نقشے نظر آتے ہیں۔

کبھی خواب میں انسان ایسے نقشے دیکھتا ہے، جو عقلاً محال ہوتے ہیں جیسے ایک شخص اپنے کو ہوا میں پرواز کرتے ہوئے دیکھتا ہے اور کبھی عالمِ خواب میں اس کو اس امر پر استعجاب نہیں ہوتا۔ کبھی کوئی ایسی مخلوق نظر آتی ہے جس کا وجود خارج میں محال ہے۔ ایک شخص نے یہ دیکھا کہ ایک شیر دوڑا ہوا اس کی طرف آرہا ہے اور اس کے منھ سے کثرت سے دھواں نکل رہا ہے

جس سے فضا تاریک ہوتی جارہی ہے۔ اگرچہ عقلاً یہ شکل محال ہے۔ لیکن عالم خواب کے لئے بہت ممکن ہے۔ اس میں کوئی استعجاب نہیں۔ کیونکہ تصوراتِ ذہنی میں شیر کے نقشے موجود ہیں۔ کسی نے بالمشاہدہ شیر دیکھا ہے۔ کسی نے شیر کی تصویریں دیکھی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ریلوے انجن سے دھواں نکلتے بھی بارہا دیکھا ہے۔ اس کا نقشہ ذہن میں موجود ہے۔ فرق اتنا ہے کہ انجن کی ساخت عالمِ خواب میں شیر کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ عقلی مناسبت اور مطابقت شیر اور انجن کی بعید از قیاس نہیں۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کے سامنے چلتی ہوئی انجن کا آجانا، اس کی زندگی کے لئے ویسا ہی خطرناک ہے، جیسا کہ ایک شیر کا پہنچنا۔ اس لئے شیر کی جگہ پر انجن اور انجن کی جگہ پر شیر، ذہنی اہمیت کے لحاظ سے بعید نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ جب کہ قوتِ ممیزہ نے اپنا کام چھوڑ دیا ہو۔

خواب میں ہمیشہ یہ نہیں ہوتا کہ کسی چیز کی اصلی شکل ہو بہو ظاہر ہو۔ بلکہ اکثر مثالی شکلیں نظر آتی ہیں۔ بالخصوص غیر مادی چیزوں کا اکثر انکشاف مادی شکلوں میں ہوتا ہے۔ قبل اس کے کہ میں توجیہہ بیان کروں، اس بات کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ کہ خیالی دنیا میں مادی اور غیر مادی چیزیں ایک ہی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ مادی چیز کا نقشہ یا تصویر مادیت سے خالی ہوتی ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ شیر کی تصویر جسامت اور اس کے لوازماتِ خارجی سے ہمیشہ پاک ہوتی ہے۔ ہر

تصویر کی اہمیت عالمِ خیال میں اس کے حُسن و قبح، اس کے نفع و نقصان کی صلاحیت کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ جب کسی فنا کرنے والی چیز کا خیال آتا ہے، تو آگ، پانی اور ہوا کا نقشہ سامنے آجاتا ہے اور کبھی بعض ان اسلحہ یا ادویہ کا تصور آجاتا ہے، جو انسانی ہستی کے فنا کرنے کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ آگ کا تصور اس لئے آتا ہے کہ اکثر چیزیں جل کر فنا ہو جاتی ہیں۔ بعض چیزیں گھُل مِل کر فنا ہوتی ہیں اس لئے پانی کا تصور ذہن میں آتا ہے اور بعض بخارات ہوا میں مل کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہوا کا خیال آتا ہے۔

یہ نہیں ہوتا کہ ہمیشہ ایک چیز کا نقشہ ایک ہی جذبہ یا ایک ہی اثر ظاہر کرنے کو پیش ہو۔ کیونکہ ہر شئے کی مختلف حیثیتیں ہیں۔ اس لئے مختلف چیزیں مختلف اوقات میں معنی ظاہر کرنے کو تصور میں یا خواب میں آتی ہیں۔ ایک آگ ہے کہ کبھی اس سے کسی چیز کے فنا کرنے کا اثر ظاہر ہوتا ہے، کبھی اس سے روشنی کا کام لیا جاتا ہے، کبھی کسی چیز کے گلانے اور پکانے کا کام لیا جاتا ہے۔ کبھی اس سے کسی چیز کا تصفیہ ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی عالمِ خواب میں فنا اور نیستی کا نقشہ آگ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی اس سے حسد اور عداوت ظاہر ہوتی ہے، کبھی روشن خیالی اور نور ایسے خواب کی تعبیر ہوتی ہے۔ کبھی محنت اور سرگرمی مراد ہوتی ہے، کبھی صلح، استغفار اور مغفرت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ تعبیر خواب ایک اہم فن ہے جس کے

حصول کے لئے نہ صرف علمِ نفسیات کا ماہر ہونا ہی ضروری ہے۔ بلکہ طبیعات سے بھی واقفیت حاصل کرنا لازمی ہے۔ ایک شخص خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے گھر میں آگ لگی ہوئی ہے اور گھر والے سب کے سب اس میں گھِر گئے ہیں اور اسی حالت میں اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ اس کی تعبیر بیان کرنے سے پہلے آپ کو اس سے چند باتیں دریافت کر لینی ضروری ہیں:

(۱) اس منظر سے اس کے دل پر کیا اثر پڑا۔
(۲) خواب کے قبل اس کے دماغ میں کیا تخیلات تھے۔
(۳) خانہ جنگی کا کوئی اثر ہے یا نہیں۔
(۴) آپس میں صلح و آشتی کا کوئی نیا ذریعہ قائم ہونے والا ہے یا نہیں۔
(۵) کسی نئے مفید یا غیر مفید مسئلہ پر مشورہ درپیش ہے یا نہیں۔
(۶) کوئی کسی شادی یا غمی کی خبر قبل سے معلوم ہے یا نہیں۔
(۷) کسی خاص عقیدے مذہب کی بحث چھڑی ہے یا نہیں۔

از یں قبیل مختلف سوالات کی ضرورت ہے۔ ان سوالات سے ماحول کا پتہ چل جائے گا اور ماحول کا پتہ چل جانے کے بعد اسی کی مناسبت سے تعبیر بیان کرنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ ذہن ماحول کے اثرات سے متاثر ہو کر کوئی خاص نقشہ قائم کرتا ہے، جو حالتِ خواب میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

بعض خواب جسمانی عوارض کی وجہ سے کسی خاص شکل میں ظاہر ہوتے ہیں

ایک وہ شخص جس کے دماغ میں سوداوی مادے زیادہ موجود ہوں، وہ اکثر خواب میں تاریکی دیکھتا ہے اور مختلف قسم کے ہولناک مناظر اس کے نظر کے سامنے آتے ہیں۔ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ جب وہ سوتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک شخص آگ روشن کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کو اس آگ میں ڈالے اور وہ ڈر کر بھاگتا ہے۔ میں نے بتا دیا کہ اس کے مزاج میں صفراء کا مادہ بڑھ رہا ہے۔ جس کی وجہ سے خون میں احتراق پیدا ہو رہا ہے اور سوداویت بھی بڑھ رہی ہے۔ چنانچہ تنقیہ ہوا اور وہ چین کی نیند سونے لگا۔ میری یہ تعبیر اس اصول پر مبنی تھی کہ احتراق کا تعلق مزاج میں صفرا سے ہے اور آگ کی سرخی خون پر دلالت کرتی ہے اور دوسری طرف دھوئیں وغیرہ سے سوداویت ظاہر ہوتی ہے۔

امراض جسمانی کے علاوہ اخلاقی حُسن و قبح بھی خوابوں سے ظاہر ہوتا ہے اور بعض اوقات کسی شخص کی سیرت کا اندازہ لگانے کا سب سے بہتر ذریعہ خواب ہوتا ہے۔ بعض ایسے جذبات کا انکشاف خوابوں کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے۔ جس سے صاحبِ خواب خود غافل ہوتا ہے۔ ہر خاص و عام کے لئے یہ سمجھنا دشوار ہے کہ انسان کیونکر خود اپنے جذبات سے غافل ہو سکتا ہے۔ یہ فلسفۂ نفسیات کا نہایت دلچسپ نظریہ ہے اور اس سے بہت مفید نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا دار و مدار اس کلیہ پر ہے کہ قوتِ مدرکہ کی ۲ دو قسمیں

ہیں۔ مدرکۂ ظاہرہ اور مدرکۂ باطنہ۔ لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ مدرکۂ ظاہری کے ذریعہ سے صورتِ خیالی قائم ہوتی ہے۔ اور کبھی کبھی مُدرکۂ باطنی سے بھی صورت خیال پیدا ہوتی ہے اور اسی مدرکۂ باطنی پر نتائج خواب کا مدار ہے۔ مُدرکۂ ظاہری کا تعلق حواس خمسہ ظاہرہ سے ہے اور مدرکۂ باطنہ کا حواسِ باطنہ سے۔ منافع الاعضاء کے علاوہ افعال مدرکہ باطنہ کے تحت انجام پاتے ہیں۔ جس طرح ایک انسان اس امر سے واقف نہیں ہوتا کہ کون سا غیر فطری مادہ کس عضو میں جمع ہو رہا ہے، جو کسی وقت عارضۂ جسمانی کا سبب ہو جائے گا۔ جب عارضہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے عضو بدنی پر نقصان ظاہر ہوتا ہے، تب کہیں اس کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح بعض کیفیتِ دماغ یا قلب، جس کا تعلق انہیں مُدرکۂ باطنہ سے ہے، اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی، جب تک اس کا اثر حواس ظاہرہ پر نہیں پڑتا۔ کبھی کبھی کوئی عداوت یا محبت طبیعتِ انسانی کی باطنی فضا میں موجود ہوتی ہے۔ لیکن انسان کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ ایسے ایسے جذبات اکثر خواب سے ظاہر ہو جاتے ہیں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اپنے جذبات کو دباتا ہے اور اپنے عمل کے زور سے اس کو دور کر دیتا ہے۔ اس کا تصورِ ذہنی اس سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ لیکن طبیعتِ باطنی اس سے آشنا رہتی ہے۔ ایک پرہیزگار شخص خواب دیکھتا ہے

کہ اس کے سامنے شراب لائی گئی، وہ پیالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور جھجکتا ہے اور
آخر کار کچھ سوچ کر ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے اور شراب نوشی کے ارتکاب سے
باز رہتا ہے۔ اس خواب سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ شراب کے ارتکاب سے بچا۔ لیکن
اس کا ضمیر اس خیال سے خالی نہیں ہے۔ اس طرح رنج وغم، راحت ومسرت
عداوت ومحبت جو اس کے اندر پوشیدہ ہے کبھی کبھی خواب سے ظاہر ہو جاتی
ہے۔ اس لئے دور اندیشی کا تقاضا ہے کہ خواب ہر خاص وعام پر ظاہر نہ کیا
جائے کیونکہ اس بات کا ڈر ہے کہ وہ جذبات قلبی جس سے وہ خود غافل ہے
دوسروں پر ظاہر ہو جائیں۔ یہی سبب ہے کہ بزرگان نے عوام کے سامنے خواب
بیان کرنے سے منع کیا ہے۔

خواب میں جذبات اپنی اصلی حالت میں ظاہر ہوتے ہیں اور کبھی ان کا
عکسِ نقیض نظر آتا ہے اگر زید خواب دیکھے کہ وہ بکر کا جانی دشمن ہے اور اس
کے قتل کی سازش کر رہا ہے، تو اس سے سمجھنا لازم نہیں کہ زید کے دل میں
بکر کی عداوت کا جذبہ پوشیدہ ہے کیونکہ بہت ممکن ہے کہ اس کی انتہائی محبت
کا عکسِ نقیض اس شکل میں ظاہر ہوا ہو، تصورِ ذہنیہ میں کبھی ایسا ہوتا ہے
کہ نقشِ خیالی بالکل الٹ جاتا ہے جس کی وجہ سے دشمنی محبت کی صورت
میں اور محبت دشمنی کی صورت میں نظر آتی ہے۔ اگر کوئی یہ کہے کہ یہ عقلاً
کیونکر ممکن ہے کہ ایک چیز عالمِ خیال میں اپنے ضد کی شکل اختیار کرلے اس

معمہ کو آپ یوں سمجھیں کہ (الاشیاء تعرف باضدادہا) کوئی شئے ذہنی اس وقت
تک متشخص نہیں ہوتی جب تک اس کے اضداد کا تخیل کسی نہ کسی صورت میں
موجود نہ ہو، محبت کی سب سے آسان تعریف یہ ہے کہ وہ عداوت کی ضد
ہے۔ جب تک تاریکی کا تخیل موجود نہ ہو، روشنی کا تصور عقلی محال ہے۔ میں
کہہ چکا ہوں کہ خواب میں قوتِ ممیزہ معطل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے دماغ اپنی
مشغولیت کی غرض سے ہر صورتِ خیال کو الٹ پھیر کر دیکھنے لگتا ہے۔ یہی
سبب ہے کہ جب ایک نقشہ سیدھا نظر آتا ہے، تو کبھی کبھی اس کا الٹا نقشہ
ظاہر ہو جانا بہت ممکن ہے، ہر چیز کو اپنی اصلی حالت پر قائم رکھنا
قوتِ ممیزہ ہی کا کام ہے۔ اس کے بغیر ہر طرح کی گڑبڑی پیدا ہو جانا
ممکن ہے۔

سب سے زیادہ تعجب خیز کیفیت خواب کی یہ ہوتی ہے کہ کبھی کبھی ایک
شخص وہ جذباتِ خواب میں دیکھتا ہے، جو کسی دوسرے شخص کے دل میں
ہوتے ہیں۔ ایسا ہوتا ہے کہ زید خواب دیکھ لیتا ہے کہ بکر اس کے قتل کی
سازش کر رہا ہے۔ اس کی تعبیر کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ بکر کے دل میں زید
کی عداوت پوشیدہ ہے۔ کبھی اس کی تعبیر یہ ہوتی ہے کہ بکر زید سے
غایت محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ میں کہہ چکا ہوں کہ بعض اوقات خواب میں
عکسِ نقیض بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ایک شخص کا جذبہ جو

ابھی دل و دماغ میں پوشیدہ ہے، وہ دوسروں پر کیوں کر ظاہر ہو جاتا ہے۔

یہ نظریہ ماہرانِ فلسفہ نفسیات کے نزدیک مسلم ہے کہ ایک شخص کے خیالات دوسرے پر منعکس ہوتے ہیں اور یہ طاقت فطری ہے، اس کا استدلال تجربات سے ہوتا ہے۔ کتب نفسیات میں ایسے تجربات بے شمار مندرج ہیں جن سے انعکاسِ خیال ثابت ہوتا ہے۔ آپ جب چاہیں آزما کر دیکھ لیں کہ کوئی ہشیار سے ہشیار کینہ کش جب کبھی اپنے دلی کینہ کو چھپا کر خلوص و محبت کا اظہار کرنے لگتا ہے، تو ایک معمولی سمجھ والا انسان اگر پوری طرح متیقن نہیں ہوتا کہ کینہ اور عداوت کے جذبات چھپائے جا رہے ہیں تو کم از کم مشکوک ضرور ہو جاتا ہے اور اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس کے دل میں آپ کی طرف سے خلوص ہے۔ آپ کا دل خود بخود اس کی طرف مائل ہوتا ہے اور کبھی آپ خود اس میلانِ طبع سے متعجب ہو جاتے ہیں۔ بارہا تو یہ ہو چکا ہے کہ جب کوئی خطرہ آنے والا ہوتا ہے، تو خود بخود دل میں اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ انہی واقعات پر انعکاس خیالی مبنی ہے۔

ہم کبھی خواب میں پیش آنے والے واقعات دیکھ لیتے ہیں، فرائڈ کا خیال ہے کہ کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ جن آنے والے واقعات سے ذہن بالکل خالی ہے۔ ان کے متعلق انسان کوئی خواب دیکھ سکے۔ ان کے سامنے جب کبھی ایسا خواب پیش کیا جاتا ہے کہ جس سے کسی واقعہ کی واقفیت پہلے سے

خواب دیکھنے والے کے علم یا خیال میں موجود نہیں تو وہ اس کا تجسس کرتے ہیں کہ کسی عنوان سے اس واقعہ کا علم یا اس کے لواحق کا علم ہو، صراحتاً یا کنایتہً یا ضمناً کسی طرح اس کے علم کا ذہن پر اثر پڑ چکا ہے۔ کیونکہ وہ خیال کو محض ایک آئینہ سمجھتے ہیں، جس پر وہی چیز منقش ہوتی ہے، جو اس کے سامنے ہو یا فوٹو کا کیمرہ جس میں وہی تصویریں آتی ہیں، جو سامنے گذرتی ہیں اور ان کے نزدیک ادراک کا ذریعہ محض حواس خمسہ ظاہری ہیں۔ لیکن میرے نزدیک سب سے بڑا ذریعہ ادراک کا وہ چیز ہے، جس پر حواس خمسہ کا وجود منحصر ہے۔ یعنی روح، جب روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے، تو حواسِ خمسہ کا وجود باقی نہیں رہتا۔ وجود انسانی کی ساری طاقتیں فیضانِ روحانیہ کا نتیجہ ہیں اور یہ امر مسلم ہے کہ روح حواسِ خمسہ کی محتاج نہیں بلکہ حواسِ خمسہ اپنی قوتِ ادراکیہ روح سے حاصل کرتا ہے۔ روح میں بغیر جسم کے بھی ساری صلاحیتیں موجود رہتی ہیں۔ ہمارے اس نظریہ کا دارومدار ان انکشافات روحانیہ پر ہے، جو آج یورپ و امریکہ سے ظاہر ہو رہے ہیں اور تمام مذاہب عالم اور حکمائے سلف قوتِ روحانیہ کو مانتے آئے ہیں۔ ہم آئے دن تجربہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کسی عارضی طریقہ پر بھی حواسِ خمسہ کو سست کر دیا جاتا ہے۔ طاقتِ روحانی بڑھ جاتی ہے اور ایک زندہ شخص کی روح عالم ارواح سے تعلق پیدا کر لیتی ہے۔ آج اسی طریقہ سے (HYPNOTISM) مراسلات

روحانیہ جاری ہیں۔ میں اس بحث پر اپنے مضمون "روحانی دنیا" میں ایک حد تک روشنی ڈال چکا ہوں اور ابھی ضرورت ہے کہ موقع پاکر اس کی وضاحت کی جائے۔ اس وقت بھی اتنا بتا دینا ہے کہ جب حالتِ خواب میں انسان کے حواسِ خمسہ معطل ہو جاتے ہیں اور انہماکِ شغلی سے روح کو فرصت ملتی ہے، تو روح، عالمِ ارواح میں سیر کرنے لگتی ہے۔ اس اثنائے سیر میں بعض پیش آنے والے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں۔

یہ مسئلہ عوام کے نزدیک قابلِ قبول نہیں ہو سکتا کہ ہونے والے واقعات کا انکشاف عالمِ ارواح میں کیونکر ممکن ہے۔ یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ روح، عالمِ خواب میں ارواح کی سیر کرتی ہے، تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہونیوالے واقعات کا پتہ عالمِ ارواح میں مل جائے۔ حضرت محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ میں عالمِ مثال اور عالمِ ارواح کی بحث میں ہونے والے واقعات کا ممثل ہونا صراحت سے تحریر فرمایا ہے۔ علاوہ اس کے اور بزرگان نے بھی ارواح کی پیشین گوئیوں کے واقعات تحریر فرمائے ہیں۔ لیکن اس دورِ مغرب زدگی میں جب تک مغربی محققین کا حوالہ نہ دیا جائے کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ اس لئے میں سر اولیور لوج کی کتاب روحانی دنیا کے حوالے سے ریمنڈ کا یہ بیان پیش کر دینا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جب کوئی حادثہ وقوع پذیر ہونے لگتا ہے، تو کچھ روز قبل اس کا عکس ایک

روشن ستون کی صورت میں اس عالم سے اس عالم تک پہنچتا ہے۔ جس سے سمجھ لیتے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے، یہ بیان اس سلسلے کے سوال و جواب میں ہے کہ ریمنڈ نے اولیور لوج کو کہہ کر قبل سے متنبہ کر دیا تھا کہ اس پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ جب ایک درخت سے ٹکر لگنے کا حادثہ وقوع پذیر ہوا، تب اولیور لوج نے ریمنڈ سے روحانی مراسلات کے سلسلے میں دریافت کیا کہ اس واقعہ کی خبر اس کو قبل از وقت کیوں کر ہوئی۔ کتاب مذکور میں متعدد پیشین گوئیاں درج ہیں، جو روحانی مراسلات سے ظاہر ہوئیں اور ان کی صداقت کا تجربہ ہوا، ایسے خواب کا تعلق روحانیات سے ہے۔ انہیں روحانی کہتے ہیں ان میں پیشین گوئیاں ہوتی ہیں اور کبھی کبھی ہونے والے واقعات منکشف ہو جاتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ روحانی خواب کا تعلق ہمیشہ عالمِ ارواح سے ہو۔ بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خواب میں ایک شخص ایسے مقام کی سیر کر لیتا ہے جس کو اس نے بیداری میں کبھی نہیں دیکھا۔ کبھی گم شدہ اشیاء کا پتہ چلا لیتا ہے اور جب بیدار ہو کر تلاش کرتا ہے، تو وہیں پاتا ہے۔ جہاں خواب میں دیکھتا ہے، یوں تو سیکڑوں خواب تشریحِ تصدیق کے ساتھ ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ لیکن اس مضمون میں درج کرنے کی گنجائش نہیں محض ایک مختصر خواب جس کا مجھے ذاتی تجربہ ہے پیش کرتا ہوں۔ ایک

طلائی زیور ایک مختار صاحب کے یہاں گم ہو گیا۔ مولوی عبد اللطیف صاحب مرحوم کو خبر ہوئی، دوسرے دن خواب سے بیدار ہو کر آپ نے کمرہ کی چوکی کو ہٹانے کا حکم دیا۔ جب چوکی ہٹائی گئی دیوار میں ایک سوراخ نظر آیا۔ مولوی صاحب موصوف نے اس سوراخ کو کھدوایا۔ کچھ دور پر وہ گم شدہ زیور ملا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ یہ زیور اس سوراخ کے اندر ہے اور جب تک نہ ملا تھا، شبہ تھا کہ شاید یہ خواب غلط ہو گا۔ الحمد للہ کہ مل گیا اور سب لوگوں کو خواب کی صداقت کا اعتراف ہوا۔ اس مضمون میں گنجائش نہیں کہ ایسے اور خواب پیش کروں بعض ایسے واقعات خواب میں دیکھے گئے جن کا تصوّر عقل سے بعید تھا۔ گذشتہ زلزلہ بہار کے واقع ہونے کے چند روز قبل ایک محترم خاتون نے وہ واقعات مکانات کے گرنے، لوگوں کے بھاگنے اور پسنے کے دیکھے اور دیکھ کر اپنے شوہر سے بیان کیا۔ لیکن ہر شخص نے اس کو اضغاث احلام تصور کیا۔ لیکن بعد کو اس کی تصدیق ہو گئی۔

وہ پیشین گوئیاں، جو خدا کی طرف سے اولیاء اور انبیاء کو ہوتی ہیں۔ اس کا تعلق محض فیضانِ عالم قدسی سے ہے۔ جب باری تعالیٰ اپنے نبی یا ولی کو کسی واقعہ سے متنبہ کرنا یا کوئی مژدہ سنانا چاہتا ہے، تو خواب میں اس کے سامنے وہ امر پیش کر دیتا ہے۔ ایسے خواب کے متعلق

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا میں ہمارے بعد وحی تو نہیں خواب ہوا کریں گے، اس کی کیفیت اور نوعیت کے متعلق نہ کوئی نظریہ قائم کیا جا سکتا ہے، نہ توجیہہ بیان کی جا سکتی ہے۔ میں ایسے روحانی خواب کے متعلق ایک الگ رسالہ (PROPHETIC DREAM) لکھ چکا ہوں۔

سگمنڈ فرائڈ (SIGMAND FREUD) کی رائے ہے کہ جتنے خیالات یا جذبات متخیلہ کی تاریخ سطح میں مخفی ہیں، ان پر جذباتِ شہوانی غالب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمام جذبات میں احساساتِ شہوانی زیادہ غالب ہیں۔ اس لئے متخیلہ کی سب سے گہری سطح میں یہی بیٹھ جاتے ہیں۔

ان کا تو خیال ہے کہ جتنے جذبات رنج و غم، محبّت و عداوت، رغبت اور نفرت، یہ سارے کے سارے احساساتِ شہوانی کے تابع ہیں۔ ہر پسندیدگی کی تہہ میں لذّتِ شہوانی کارفرما ہے۔ ان کے اصول سے ایک جنس کی رغبت جب ہو گی، تو جنسِ نقیض کی طرف، اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ باپ کو بیٹی کی محبت زیادہ ہوتی ہے اور ماں کو بیٹے کی۔

مجھ کو فرائڈ کے نظریوں سے چند مسئلوں میں زیادہ اختلافات ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میں ان کے ہر نظریہ کی مخالفت کروں۔ میں ان کے اس کلیہ کو کلیتہً نہیں مان سکتا۔ لیکن یہ ضرور ماننا ہوگا کہ جتنے جذبات

طبیعتِ انسان میں ہیں، ان میں جذبۂ شہوانی زیادہ غلبہ رکھتا ہے۔ یعنی یہ اپنے مقابلہ میں دوسرے غلبوں کو دبا سکتا ہے۔ مگر دیکھا گیا ہے کہ بھوک اور پیاس کے غلبہ کے مقابلہ میں سارے جذبات پست ہو جاتے ہیں۔ عداوت و محبت کا محرک بھی مخفی جذبۂ شہوانی کو نہیں مانا جاسکتا۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں کھانے پینے کی سہولت زیادہ ہوتی ہے ادھر ہی محبت کا میلان زیادہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھی بارہا دیکھا گیا ہے کہ جذبات مذہبی اکثر جذباتِ شہوانی پر غالب آجاتے ہیں۔ دینداروں کی پاکدامنی کا یہی راز ہے۔

کہا جاسکتا ہے کہ اکثر عقل، تعلیم یا صحبت جذباتِ شہوانی کو دبا دیتے ہیں۔ اس لئے غیر شعوری حالت میں وہ دبائے ہوئے جذبات اُبھر پڑتے ہیں۔ اس وجہ سے حالتِ خواب میں زیادہ تر جذباتِ شہوانی کے پیدا کردہ خیالات اُبھرے رہتے ہیں۔ میں کہوں گا کہ ایسا بھی ہوتا ہے، لیکن مجھ کو اس میں اعتراض ہے کہ کہا جائے کہ ہمیشہ ویسا ہی ہوتا ہے۔ فرائڈ کی رائے کہ باپ کو بیٹی کی محبت زیادہ ہوتی ہے اور ماں کو بیٹے کی۔ تجربے سے کلیتہً ثابت نہیں ہوتی ہے۔ محبت اور نفرت کے اسباب غیر محدود ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ محبت کے لئے افادیت شرط ہے۔ لیکن افادیت کی بے شمار نوعیتیں ہیں۔ کسی موقع پر کسی کا تبسم ہی محبت کا محرک ہو جاتا ہے اور اسی طرح کبھی کسی کا کسی سوال پر محض سکوت موجبِ نفرت ہو جاتا ہے

قطع ازیں اس میں شہوانیت کا شائبہ ہو یا نہ ہو۔

میں جب کلکتہ میں تھا اور کالج کی تعلیم کے زمانہ میں مدرسہ کے آخری (فائنل) امتحان دینے کا مجھ کو شوق پیدا ہوا۔ تو مجھے ایسے استاد کی تلاش ہوئی جو معقولات، دینیات اور ادبیات سب پڑھا سکے۔ میں مدرسہ رمضانیہ کے مدرس اول مولانا عبدالعزیز صاحب سرحدی کے پاس گیا۔ اس کے قبل ان کے طریقہ درس کو دیکھ چکا تھا...... عرض کیا کہ میری آرزو ہے کہ حضور سے چند کتابیں پڑھوں۔ مولانا نے پوچھا "کون کون کتابیں پڑھنا چاہتے ہو"۔ میں نے عرض کیا مسلم، سُلّم، ہدایہ آخرین، حماسہ اور مقامات حریری، آپ مسکرائے اور فرمایا "کل آنا"۔ آپ کے اس ایجابی تبسم کا جو اثر ہوا، وہ آج تک میں محسوس کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت نے بقائے ذات تکمیل، ذات اور بقائے نسل کی غرض سے کھانے پینے کی اشتہا، علم و فضل کا شوق اور جنسی رغبت، ہر انسان میں ودیعت فرمائی ہے۔ سب سے پہلے بقائے نفس کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس لئے پہلے کھانے پینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے جو خواہش یا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہ بھوک بجھانے کا۔ چنانچہ ایک نوزائیدہ بچہ سب سے پہلے دودھ پینے کی خواہش کرتا ہے اور چونکہ خواہش کے اظہار کا ذریعہ کوئی دوسرا نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے رونے لگتا ہے اور جب ماں گود میں لیتی ہے، تو فوراً سکون

ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بچے بچپن میں ماں کے اس قدر گرویدہ رہتے ہیں جیسے کوئی عاشق معشوقہ کا۔ اس افادیت کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیٹے اور بیٹیاں دونوں جنس کی اولاد کو ماں سے زیادہ محبت رہتی ہے اور باپ سے کم۔ اگر ایسے باپ جو بچوں کو زیادہ ڈانٹتے اور جھڑکتے رہتے ہیں ان سے نفرت و عداوت نہیں تو بے اُنسی ضرور ہو جاتی ہے۔ ہوش آنے کے بعد سمجھ دار لڑکوں کو ہمدرد اور قابل استاد کی بھی محبت ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس سے تکمیلِ ذات کی غرض پوری ہوتی ہے، میرے تو بعض شاگرد ایسے ہیں، جن کو میں دوست سے کم نہیں سمجھتا اور وہ بھی مجھے باپ سے کم نہیں سمجھتے۔ یہ اثر ہے جذبۂ تکمیلِ نفس کا۔ جنسی احساس پورا شعور آنے کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے میں اس کو تیسرا درجہ دیتا ہوں۔ مگر چونکہ یہ جذبہ تمام قوائے جسمانی کے مکمل ہونے کے بعد وجود میں آتا ہے۔ اس لئے سارے جذبات سے زیادہ قوی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ عام طور پر مشاہدہ میں آچکا ہے کہ شادی ہونے کے بعد ماں باپ دونوں کی محبت کم ہو جاتی ہے اور بیوی یا شوہر کی محبت سب سے بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ عقل توازن قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔

وہ خیالات یا محسوسات جو حافظہ یا مدرکہ کی گہری یعنی غیر شعوری سطح میں چھپ جاتے ہیں۔ اس کے کئی سبب ہوتے ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ اس کی طرف توجہ کم ہوتی ہے۔ جیسے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ کلکتہ میں کسی

سائن بورڈ پر بھٹا چاریہ لکھا دیکھا، وہ ذہن سے جاتا رہا اور خواب میں جب کبھی دوا اور علاج کے تخیلات کی کڑیاں بندھ کر سلسلہ قائم ہوا، تو بھٹا چاریہ اینڈ کو (میڈیکل ہال) مدرکہ کی نچلی تہہ سے اُبھر پڑا اور خواب میں یوں دیکھا کہ بھٹا چاریہ اینڈ کو (میڈیکل ہال) میں کھڑا ہوا دوا خرید رہا ہوں۔ اس کے چھپے اور دبے رہنے کا سبب کوئی جذبۂ نفسانی یا شہوانی نہ تھا۔ بلکہ محض توجہ اور التفات کی کمی تھی یا عدمِ ضرورت کہا جائے، ضرورت کے احساس کے بعد وہ نقشہ اُبھر آیا۔ اسی طرح عدمِ توجہ یا عدمِ ضرورت کی وجہ سے بہت سے مدرکات مخفی اور پوشیدہ رہ جاتے ہیں۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ ہم مقتضائے عقل، قانونِ مذہب، قانونِ سیاست یا عامِ استطاعت کی وجہ سے اکثر جنسی احساسات کو دبائے رکھتے ہیں۔ ممیزہ کے معطل ہونے کے بعد فوراً وہ اُبھر آتے ہیں۔ غالباً اسی تجربہ کی بنا پر فرائڈ نے یہ خیال کیا کہ غیر شعوری سطح پر چھپے ہوئے احساسات یا مدرکات شہوانی ہی ہوتے ہیں۔

بہرحال مجھے یہ بتانا ہے کہ خوابوں کے تجزیئے سے اخلاقی اور طبعی اصلاحیں سہولت سے ہو سکتی ہیں۔ اس وجہ سے خواب کو ایک غیر ضروری اور بے فائدہ چیز سمجھ کر اس کی طرف سے بے توجہی برتنا بالکل غیر مفید ہے۔ بلکہ انسانی زندگی کے لئے ضرورت ہے کہ ہمیشہ انوکھے خوابوں کا تجزیہ کیا جائے اور اس سے اصلاح

کی کوشش کی جائے۔ ایک سمجھ دار انسان اپنے خوابوں سے خود اپنی اصلاح کر سکتا ہے۔

تجزیۂ خواب ایک مستقل فن ہے اور اس عنوان پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ موقع ملے گا تو انشاء اللہ اس پر علمی بحث کروں گا۔ اس وقت اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ خواب میں انسان صرف ان ہی چیزوں کو جو اس کے مدرکہ کی فلم میں محفوظ ہیں۔ نہیں دیکھتا ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ دو طرح کی اور تصویریں رہتی ہیں، جن سے کبھی کبھی آئندہ واقعات کی پیشین گوئی ہوتی ہے جن کو خود قوتِ متخیلہ اختراع کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات مدرک اپنے حوصلے، اپنے قیاس اور ضرورت کے مطابق شکلیں ایجاد کرتا ہے۔ جس کا تجربہ آپ کو فسانہ نویسوں اور شعراء کی قوتِ اختراع سے ہوتا ہے۔ آج کل جاسوسی دنیا کو پڑھیے، عجیب عجیب باتیں لکھی ہوتی ہیں اور عجیب نقشے کھینچے جاتے ہیں۔ جیسے ایک ماہر مصور دیکھی تصویریں کھینچتا ہے اور ان دیکھے نقشے بنا لیتا ہے۔ اس طرح تعطل کی حالت میں یعنی خواب میں متخیلہ کرتا رہتا ہے۔

ایسے خوابوں سے جو اختراعی ہیں۔ انسان کے شوق، حوصلے اور احتیاج کا پتہ چلتا ہے۔ خواب کے اثرات جاننے والوں کے نزدیک ایسے خوابوں کی بھی بڑی قدر ہے، جیسے ایک شخص خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ "میں ایک کوٹھے پر بیٹھا ہوا ہوں اور نیچے چند موٹر کاریں اور مال سے لدے ہوئے ٹرک موجود ہیں

لیکن جب اُترنا چاہتا ہے، تو سیڑھی نہیں ملتی۔ اس سے کم از کم یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی اعزازی منزل بلند کرنے کا شوق رکھتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ ضرورت کی چیزیں وافر طور پر حاصل کرے تاکہ دولت مند اور برسرِ اقتدار لوگ اس کی ملاقات کو آیا کریں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کو نہ کوئی ڈگری حاصل ہے، اور نہ کسی سرمایہ کے حصول کا ذریعہ ہے، جس سے وہ کوئی بڑا کاروبار جاری کرے۔

جو لوگ عیش و عشرت کا شوق رکھتے ہیں۔ ان کے خوابوں میں وہی نقشے نظر آتے ہیں، جو ان کے مدرکہ کے نچلی سطح میں پوشیدہ ہیں، جن کا اظہار وہ عوام الناس کے سامنے اخلاقاً نہیں کر سکتے۔ ایک شخص خواب میں یہ دیکھتا ہے کہ کسی ایسی مجلس میں شریک ہو گیا ہے، جس میں لہو و لعب اور پینے پلانے کے سامان مہیا ہیں، مگر وہ وہاں سے بھاگنا چاہتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خیالات تو عیاشی کے موجود ہیں، مگر اس پر مذہب اور اخلاق کا غلبہ ہے، جس کی وجہ سے وہ اس مجلس میں ٹکنا نہیں چاہتا۔

اختراعی خواب ویسے تصورات کے فلم کی تصویروں سے مرکب ہوتے ہیں کیونکہ حوصلے اور شوق کی نقاشی کے لئے وہی چیزیں کام میں لائی جاتی ہیں، جو مدرکہ کا سرمایہ ہوتی ہیں اور میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ متخیلہ یا مدرکہ کی فلم میں دو طرح کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جو نگاہوں کے سامنے سے گذرتی

ہیں۔ دوسری وہ جن کو تصورات بناتے رہتے ہیں۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ چند ہوائی جہاز آگے پیچھے اُڑ رہے ہیں۔ لیکن جب کبھی یہ خیال کرتا ہوں کہ ایک ریلوے ٹرین اپنے سارے ڈبوں کے ساتھ ہوا پر اُڑائی جا سکے، تو کیسا معلوم ہوگا۔ اب خواب میں کبھی یہ دیکھ لینا کہ ایک ریلوے ٹرین دس۱۰ بیس۲۰ ڈبوں کے ساتھ ہوا پر اُڑ رہی ہے، کوئی مشکل نہیں۔ کیونکہ میں نے شعوری حالت میں ریلوے ٹرین کے اُڑنے کا شعوری نقشہ بنا لیا تھا، وہ فلم کے اندر موجود تھا۔

جاگتے وقت بھی گفتگو آ جاتی ہے کہ ایک شخص کسی خاص مقام پر جاتا ہے، تو ڈر جاتا ہے۔ اس کو نظر آتا ہے کہ کوئی شخص محض ہوا کے سہارے ایک تاڑ کے درخت پر چڑھتا اور اُترتا ہے۔ ایک غیر شخص کے واہمہ کی تصویر بیان کی جاتی ہے اور ہماری قوت تخیل ہمارے عالم تصور میں نقشہ کھینچ لیتی ہے۔ اور وہ ہمارے ذہنی فلم کا ایک سرمایہ بن جاتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہم کبھی خواب میں یہ دیکھ لیں کہ زمین سے ایک شیر پہاڑ پر چڑھتا ہوا اُترتا ہے ہمارے تخیل نے بلندی کی مناسبت سے تاڑ کو پہاڑ بنایا اور غلبۂ خوف کے اثر سے اُس آدمی کو جس کا زمین سے چڑھنا اور اُترنا بیان کیا گیا تھا۔ اس کو شیر بنایا۔

میں نے یہ بیان کیا ہے کہ خواب میں بہت سی چیزیں تمثیلی شکل میں نمودار ہوتی ہیں۔ اب یہ بتا دینا بھی ضرور ہے کہ تمثیلی شکلیں کیونکر بنتی ہیں۔ آپ کو

معلوم ہے کہ تصور یا خیال میں کوئی شئے اپنی مادی خصوصیات کے ساتھ داخل نہیں ہو سکتی۔ جیسے میں ایک گھوڑے کا تصور کروں تو اس کی ٹانگیں یا سر یا دھڑ ذہنی انعکاس میں نہیں سما سکتا، بلکہ اس کی تصویر بن جائیگی۔ پھر بھی وہ تصویر کاغذی تصویروں سے جداگانہ حیثیت رکھے گی۔ کیونکہ ایک کاغذ پر جو تصویریں اُترتی ہیں ان میں اگرچہ جسمانی صفتیں لمبائی، چوڑائی، موٹائی تو نہیں ہوتی، لیکن سطحی صفتیں، لمبائی، چوڑائی ضرور موجود ہوتی ہیں۔ مگر متخیلہ کے فلم میں تناسب کے ساتھ لمبائی چوڑائی اور موٹائی۔ وہ تصویریں بجائے چھ فٹ کے کبھی ایک انچ میں، کبھی پچاس فٹ میں نظر آ سکتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کی جسامت سے قطع نظر ایک گھوڑا محض افادی صفت کے ساتھ متصور ہو۔ جیسے یہ کہ ایک ایسی شئے جو مجھ کو ایک جگہ تیزی کے ساتھ دوسری جگہ پہنچانے والی ہے اور چونکہ حالتِ خواب میں قوتِ ممیزہ معطل ہو جاتی ہے، اس لئے خصوصیات تمیزی کا ہونا ضروری نہیں۔ جیسے ایک گھوڑے کی خاص قسم کی دُم یا سُر وغیرہ کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ اس لئے بھی سواری ہونے کی حیثیت سے ایک گھوڑے کو ہوائی جہاز کی شکل میں دیکھ لیتے ہیں۔ اسی طرح شادی و غمی، راحت و مصیبت، خواب میں کسی مادی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جیسے مصیبت اور پریشانی کو بھی ہم ایک سیلاب کی شکل میں دیکھ

لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ ہم پانی میں غوطے لگا رہے ہیں۔ کبھی یہ دیکھتے ہیں کہ ایک سمت سے سیاہ دھواں بڑھتا آرہا ہے ازیں قبیل، خوشی کو پھول یا چراغ کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ مانی مصور اکثر اخلاقی نصیحتیں تصویروں میں ظاہر کر دیتا تھا جیسا کہ اس نے ارژنگ چین کو اپنی ہدایات کا مجموعہ بنایا تھا۔ اسی طرح خواب میں غیر مادّی چیزیں بھی کبھی کبھی مادّی شکلوں میں نمایاں ہوتی ہیں۔

تمثیلی خوابوں کی تعبیر بیان کرنے میں مماثلت کے مختلف پہلو پر غور کرنے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے ایک دوست نے ایک دن مجھ سے بیان کیا کہ "میں نے دیکھا ہے کہ ایک بڑا سانپ میری کمر میں لپٹا ہوا ہے۔ بڑی مشکل سے اس کو نوچ کر پھینکا۔ لیکن اس نے ڈسا نہیں" چند ماہ بعد ان پر خیانت کا بہت سخت الزام لگا۔ لیکن بڑی مشکل سے ان کو براءت ہوئی اور بے جرم قرار پائے۔ دوسرے صاحب نے بجنسہٖ ایسا ہی خواب دیکھا، وہ کوئی دوا بنا رہے تھے کہ ان کے کپڑے میں آگ لگ گئی، کپڑا بہت دور تک جل گیا لیکن آبلہ نہ آیا۔ یہاں سانپ خطرے اور مصیبت کی تمثیلی شکل بن کر حاضر ہوا تھا۔ مگر جو لوگ خواب میں پیشین گوئیوں کے ظاہر ہونے کے قائل نہیں، وہ یہ کہیں گے کہ یہ تمثیلیں کسی گذشتہ واقعہ سے تعلق رکھتی ہیں یعنی زمانۂ ماضی میں کوئی خطرہ یا کوئی مصیبت لاحق ہوئی ہوگی۔ جس کا

نقشہ ان کے ذہن میں سانپ کی مہیب شکل میں موجود تھا۔ اب عالم خواب میں اس شکل میں ظاہر ہوا۔

یہ تو ہر ماہر نفسیات مانتا ہے کہ گذشتہ دنوں کے تخیلی نقشے ذہنی فلم میں محفوظ ہیں، وہ عالم خواب میں بھی کبھی کبھی اصل شکل میں نظر آتے ہیں اور کبھی غیر مرتب شکل میں۔ کبھی ایک بالکل نئی طرح کی صورت میں جس میں چند نقشوں کا جوڑ توڑ معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس کی تمثیلی شکل بن جاتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جو روحانیت کے بھی قائل ہیں، ان کا تجربہ ہے کہ آنے والے واقعات بھی خواب میں کبھی اصلی صورت میں اور کبھی تھوڑے تغیر کے ساتھ اور کبھی بالکل تمثیلی شکل میں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بالکل متضاد شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس وقت میں خواب کی پیشین گوئی سے بحث نہیں کرتا صرف یہ بتانا ہے کہ خواب تمثیلی شکلوں میں بھی نمایاں ہوتے ہیں۔ جیسے میں پہلے بتا چکا ہوں کہ دھواں پھیلتا ہوا انجن ایک شیر کی شکل میں نمایاں ہوا، جس کے منھ سے دھواں نکل رہا تھا۔

خواب میں کبھی ایک مادّی یا غیر مادّی شئے متضاد شکل میں نظر آتی ہے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ وہ اور اس کا ایک دوست دونوں ایک دہکتی آگ کے اندر پڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کی تکلیف محسوس کر رہے ہیں۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ دونوں ایک دوسرے سے دور تھے اور دونوں

کو ایک دوسرے سے ملنے کا بے انتہا شوق تھا۔ یہاں تک کہ کھانا پینا، ہنسنا بولنا، سیر و تفریح دونوں طرف ترک تھا، اس کی تعبیر یہ تھی کہ دونوں محبت کی آگ میں جل بھن رہے تھے۔ اس خواب میں محبت جو سراسر لطف اور لذائذ سے بھری ہوئی ہے، وہ آگ کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ کیونکہ اس کا پریشان کن اثر جو حالتِ فراق میں ظاہر ہوا وہ آگ کی طرح دونوں کو مضطرب و پریشان کر رہا تھا۔

کبھی دوستی، دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شخص نے دیکھا کہ اس کا کوئی دوست اس کو کھا جانا چاہ رہا ہے اور منھ پھاڑ کر لپکا آ رہا ہے۔ تفتیش سے معلوم ہوا کہ دونوں کے درمیان کوئی شائبہ عداوت کا نہ تھا۔ بلکہ دونوں کی یکجہتی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ دوست جو معلوم ہوتا تھا کہ کھائے جاتا ہے، اس کی کوشش یہ تھی کہ اپنا مکان چھوڑ کر اس کے مکان میں آ جائے اور سارے کاروبار ایک کر لئے جائیں۔ یعنی وہ اپنے دوست کی تشخصات فنا کر کے اپنے تشخصات ذاتی میں محو کرنا چاہتا تھا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خوشی کو غم اور غم کو خوشی کی شکل میں دیکھتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ خوشی میں دل پر جیسا گہرا تاثر ہوتا ہے۔ ویسا ہی غم میں بھی ہوتا ہے اور قوت ممیزہ غم کو غم اور خوشی کو خوشی کر کے ظاہر کرتی ہے۔ لیکن چونکہ خواب میں قوتِ ممیزہ معطل ہوتی ہے اس لئے خوشی کو

غم اور غم کو خوشی کی شکل میں دیکھنے لگتے ہیں۔ خواب کی تعبیر کہنے کے وقت سمجھنے اور غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

خواب کی تبدیلیوں اور تغیرات کا کوئی خاص قاعدہ نہیں بیان کیا جا سکتا ہے۔ ماحول اور واردات کی طرف توجہ کرنے سے صورت حال قائم ہوتی ہے۔ اکثر ماہر نفسیات کو خاص ملکہ ہوتا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ خواب سے اخلاقی عادات اور امراض کا پتہ چلتا ہے۔ اور پتہ چلنے کے بعد اس کی اصلاح کی تدبیریں کی جا سکتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص جب سوتا ہے، اس کو نسوانیات ہی نسوانیات نظر آتے ہیں مگر ایسا ہو تو یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ دیکھنے والا کسی جنسی عشق یا محبت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ بعض نوجوانوں کو خواب میں لطیف مناظر نظر آتے ہیں۔ اگر اس کی کثرت ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ دیکھنے والوں کو اپنی موجودہ رہائش پسند نہیں، بلکہ وہ لطافت اور سجاوٹ کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ خوابوں سے محبت اور عداوت کا میلان ظاہر ہو جاتا ہے اور کبھی کبھی جرائم کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس کی تفصیل "تغیراتِ خواب" میں مکمل کی جائے گی۔

واضح رہے کہ خواب سے جن عوارض کا پتہ چلے ان کا علاج بالمثل کرنے میں کامیابی ہونے کی امید ہے، علاج بالضد عموماً مہلک ثابت ہوتا ہے۔ یعنی اگر دیکھا جائے کہ کسی کو کسی کا عشق ہے، تو اس کا علاج وصل کے سوا کوئی دوسرا زیادہ مفید نہ

ہوگا یا جس شخص کو نفاست کا شوق ہے۔ حتی الوسع اس کی رہائش میں نفاست پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ جو تخیل غیر شعوری سطح پر قائم ہو چکا ہے۔ اس کو شعوری تدبیروں سے نکال پھینکنا ناممکن ہے۔ شعوری تدبیریں یا تعلیمات اور تلقینات کا غیر شعوری سطح تک پہنچانا دشوار ہو جاتا ہے۔

اگر بالفرض ایجابی تدبیریں یعنی علاج بالمثل عملاً ناممکن ہو تو اس کو غیر شعوری عالم میں لاکر تلقین کرنی ہوگی یعنی (HYPNO TISE) کر کے تلقین کی جائے گی۔ یا مخدراتِ عقل ادویہ استعمال کر کے۔ غرض ایک مصنوعی خواب پیدا کرنا ضروری ہے۔ اس کی بہتر صورت وہ ہوتی ہے، جو صوفیہ کرام توجہ کر کے باطنی طور پر عمل میں لاتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ شعوری عالم کی تلقین کو غیر شعوری سطح تک پہنچانا انسان کے بس میں نہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ رویائے صادقہ جن میں ہونے والے واقعات کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں۔ ان کے ذرائع اور اسباب کو سمجھنا عقلِ انسانی کے لئے مشکل ہے۔ کیونکہ وہ بداہتہً ظاہر نہیں ہوتے ان کا دارومدار قیاسات پر ہے۔ لیکن یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ علم کے حصول کے قطعی دو ذرائع ہیں ایک بداہت دوسرا قیاس۔ لیکن قیاسات کو بھی بداہت سے متعلق رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ ایسے قیاسات جن کو بداہت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا ان کو فلاسفہ قیاس مع الفارق کہتے ہیں اور یہ عقل کے نزدیک قابلِ قبول نہیں

اس لئے میں پہلے علم کے ان ذرائع سے بحث کروں گا جن کا تعلق حواسِ ظاہری سے ہے۔

حواسِ ظاہری ہمیں ظاہر "مرئی" اور نمایاں چیزوں کو معلوم اور محسوس کرنے کے لئے عطا ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی قوتِ شامہ اور لامسہ ایسی چیزوں کو محسوس کرتے ہیں، جو بدیہی طور پر نمایاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ بُو ایسی چیز ہے جس کو انسان دیکھ کر یا چھو کر محسوس نہیں کر سکتا، اسی طرح سردی اور گرمی ظاہری ذرائع سے معلوم نہیں کی جا سکتی۔

حواسِ خمسہ ظاہری کی طاقت محدود ہے، آنکھوں سے ایک خاص حد تک دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح سے آواز بھی بغیر کسی دوسرے آلے کی مدد لئے ہوئے زیادہ دور سے نہیں سن سکتے اور ذائقہ اور لامسہ تو زیادہ محدود ہے۔ کیونکہ بغیر کسی چیز کو زبان پر رکھے ہوئے نہیں چکھ سکتے اسی طرح سردی اور گرمی بغیر اپنا جسم سٹائے ہوئے نہیں جان سکتے۔

حیرت تو یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ سارے کائنات کی حقیقت انہی ناقص آلات سے معلوم کر لیں اور عقل جس پر ہماری ہر تھیوری (THEORY) کا دارومدار ہے۔ اس کے آلۂ کار یہی حواسِ خمسہ ہیں، انہی سے اپنے وجود کے قبل کے حالات بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں اور وجود کے ختم ہونے کے بعد کے بھی۔ خدا کو بھی انہی سے پہچاننا چاہتے ہیں اور "جنت" و "دوزخ" "فرشتے" اور "جن" کو بھی اور

اپنی سے نبوت کی بھی جانچ کرتے ہیں اور وحی الہٰی کی بھی۔ لطف تو یہ ہے کہ جو کچھ ہماری عقل میں نہ آسکے، اس کا انکار کر بیٹھتے ہیں اور اپنی ضد پر اڑ جاتے ہیں۔

کچھ دن قبل انسان ایتھر اور اس کے حلقوں کو نہ جانتا تھا اور نہ تسلیم کر سکتا تھا اور آج گھر گھر ریڈیو بج رہا ہے، اسی ذریعے سے دُور دُور کی آوازیں ہمارے کانوں میں آرہی ہیں اور ہم اس پر پورا اعتماد کرتے ہیں۔ آج کل تمام اخباری خبروں کا دارومدار ریڈیو ہی پر ہے اور آج تک میں نے نہیں سُنا کہ ریڈیو سے کوئی ایسی خبر سنی گئی ہو، جس کو ناشر نے نشر نہ کیا ہو۔ یا خود بخود ریڈیو میں غلط خبر آگئی ہو۔

آج بھی ہم میں سے بہت سارے پڑھے لکھے لوگ بھی ایٹم کے اجزاء کو نہیں جانتے اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ان اجزاء میں کتنی بڑی طاقت ہے۔ آج نیوکلیئر کا اتنا وسیع اثر بیان کیا جاتا ہے کہ باوجودیکہ چند ماہ قبل پھینکا گیا ہے، آج تک کرۂ ارضی کے گرد کی تمام فضائیں مکدر ہیں اور موسم میں بھی تغیر ہو گیا ہے۔

آج بھی روح اور روح کی طاقتوں سے انکار کیا جارہا ہے۔ حالانکہ روح کے اثرات چلتے پھرتے مچھروں، مکھیوں، سانپ، چھچھوندر، چوپائے اور انسان اور پرندوں میں اپنی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک بپھرتا ہوا شیر ہاتھی کو مار دیتا ہے اور جب خود اس پر ایک گولی جم کر پڑتی ہے تو ٹھنڈا ہو جاتا ہے، نہ طاقت رہتی ہے، نہ جراءت کیا چیز ہے، جس کے نہ ہونے پر اتنی بڑی طاقت سرد ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ اسی طاقت کو روح کہتے ہیں۔

روح ہی کی مدد سے ہماری حواس خمسہ ظاہری اور باطنی کام کرتے ہیں اور روح نہ ہو تو ساری طاقتیں معطل ہو جاتی ہیں۔

حیرت ہے کہ ان طاقتوں پر ہم کو زیادہ بھروسہ ہے۔ جو روح کی مدد سے کام کرتی ہیں، اور روح اگر علیحدہ ہو جائے، تو وہ سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ لیکن ہم روح کی طاقت کی طرف توجہ نہیں کرتے اور جب کوئی شخص اس کے متعلق کچھ بتانا چاہتا ہے تو ہم بے اعتنائی کے ساتھ نظر انداز کرتے ہیں۔

یہ تو تمام علمائے نفسیات جانتے ہیں کہ خواب عالم لاشعوری میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی بہت سی حرکتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے تحت الشعور سے بھولے ہوئے نقشوں کو عالم خواب میں سامنے لے آنا اور اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ بھولے ہوئے ذہنی مشاہدوں میں مطابقت اصلی موجود ہوتی ہے۔ یہ سارے کرشمے کیسے وجود میں آتے ہیں اور اکثر مشاہدے ذہن پر جم جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی بیدار ہونے پر بھی دیکھے ہوئے خواب یاد رکھتا ہے۔ یہ سارے عمل کس طرح وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ میں تو قائل نہیں کہ کہہ دیا جائے کہ خود بخود ہوتے رہتے ہیں، کوئی حرکت یا تغیر و تبدل کبھی خود بخود نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی قوت کام کرتی رہتی ہے۔ میں اسی قوت کو روح کہتا ہوں۔ کیونکہ جب روح جسم سے علیحدہ ہو جاتی ہے، تو کوئی حرکت ذہنی یا جسمانی نہیں ہوتی۔

علمائے متقدمین روح کے وجود اور اس کی طاقتوں کو مانتے آئے ہیں اور

اس دورِ ترقی میں بھی ایک جماعت ہے جو روحانیات کے تجربے اور مشاہدات میں مشغول ہے۔

روحانیات کے تجربے کے متعلق میں صرف سر الیور لوج کا ذکر کرنا چاہتا ہوں کیونکہ آج کے ماہرینِ سائنس الیور لوج سے واقف ہیں۔ وہ کیمبرج یونیورسٹی میں طبیعات کے پروفیسر تھے اور انہوں نے طبیعات میں چند کتابیں لکھی ہیں جو ابھی یورپ میں سائنس کے نصاب میں داخل ہیں، وہ انگلینڈ کی روحانی محققین کی جماعت میں شامل رہ چکے تھے، ان کی دو کتابیں "ریمنڈ" "REMOND" یعنی انہوں نے اپنے لڑکے "ریمنڈ" کی موت کے بعد گذشتہ جنگ عظیم کے دوران میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی روح سے مراسلات کئے تھے ان مراسلات کو جمع کر کے شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب "حیات بعد الممات" "RIVIVAL OF THE DEAD" جس میں انہوں نے اکثر روحوں سے جو مراسلات کئے ہیں، وہ درج ہیں، میری نظر سے گذری ہیں اور میں نے بغور مطالعہ کیا ہے اگرچہ مجھ کو روحانیات کا علم تو دوسرے ذریعوں سے حاصل ہو چکا تھا پھر بھی موجودہ تحقیقات کا علم ان سے حاصل کیا ہے۔

الیور لوج کے مراسلات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ روحانیات کا ایک خاص عالم ہے۔ جہاں مُردوں کی روحیں رہتی ہیں اور زندہ انسان بھی اپنے حواسِ خمسہ ظاہر کو معطل کر کے اس عالم کی سیر کر سکتا ہے۔

جو واقعات مستقبل میں ہونے والے ہوتے ہیں۔ ان کا ایک غیر مادی نقشہ عالمِ ارواح میں پہنچ جاتا ہے اور ذکی الحس روحیں جو عذاب کی اذیت سے بری ہوتی ہیں۔ وہ ان کو سمجھ لیتی ہیں اور جب کوئی زندہ روح عالمِ ارواح میں پہنچ جاتی ہے تو کبھی کبھی ان واقعات کا ذکر آ جاتا ہے۔

چونکہ عالمِ بیداری میں حواس خمسہ ظاہری کے ربط اور تسلسل اُلجھے رہتے ہیں۔ عالمِ ارواح کی سیر کرنے کا موقع نہیں آتا۔ لیکن عالمِ خواب میں جب تمام حواس معطل ہو جاتے ہیں، تو کبھی کبھی روح کو عالمِ ارواح کی سیر کرنے کا موقع آ جاتا ہے اور اس عالم کی کچھ خبریں معلوم ہو جاتی ہیں، جن کو انسان بیدار ہو کر بیان کرتا ہے۔

عالمِ ارواح کی طرف مخاطب ہونے کے طریقوں پر صوفیائے صالحین بڑی مستعدی سے عمل کرتے تھے اور وہ طریقہ مشہور ہے کہ مراقبہ سے حاصل ہوتا ہے اور مراقبہ کیا ہے؟ آنکھ بند کر کے کسی ایک تصور میں اس طرح منہمک ہو جانا کہ کان آنکھ اور خیالات معطل ہو جائیں۔ حواسِ خمسہ کے معطل ہونے پر روح اپنی مادی مشغولیتوں سے آزاد ہو جاتی ہے اور عالمِ بالا کی سیر کرنے لگتی ہے، اسی حالت میں بعض ہونے والے واقعات معلوم ہو جاتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ ہونے والے واقعات لوحِ محفوظ پر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ روح اپنی سیر میں کبھی کبھی لوحِ محفوظ کا مطالعہ بھی کرتی ہے۔ لوحِ محفوظ بعض علمائے نزدیک

ایسا مقام ہے جہاں قضاءِ الٰہی درج ہوتی ہے ۔ جس کے متعلق میں علماءِ مادیات کی تشفی کرانے سے معذور ہوں کیونکہ یہ ساری باتیں ماوراءِ طبیعیات سے تعلق رکھتی ہیں اور جن کی معلومات طبیعیات تک محدود ہیں ۔ ان کو ماوراءِ طبیعیات کے حالات سمجھانا ناممکن ہے ۔

حقیقت ہے کہ رویائے صادقہ ماوراءِ طبیعیات سے تعلق رکھتا ہے ۔ عوام کو اس کی حقیقت سمجھانا ناممکن ہے ۔ مختصر طور پر میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ رویائے صادقہ کبھی محض روحانی سیر سے حاصل ہوتا ہے اور کبھی الہامی ہوتا ہے ، یعنی خدائے تعالیٰ بعض علم اپنے بندوں کو خاص طور پر عطا فرماتا ہے وہ کبھی فرشتوں کے ذریعے سے ہوتا ہے اور کبھی براہِ راست میرے لئے یہ بھی مشکل ہے کہ یہ بتادوں کہ خدائے تعالیٰ براہِ راست کس طرح علم عطا فرماتا ہے ۔ لیکن اہلِ باطن اس کو اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں ۔

تجربے کی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی انسان کسی واقعہ کو خواب میں دیکھتا ہے اور کچھ دن کے بعد وہ واقعہ عالمِ مادیات میں ظہور پذیر ہو جاتا ہے ۔ جیسے کسی نے خواب میں دیکھا کہ اس کے کسی عزیز کا انتقال ہو گیا ہے اور کچھ دنوں کے بعد آگ لگ جاتی ہے ، کبھی کوئی کسی دور کے شخص کو اپنے سامنے موجود دیکھتا ہے ۔ کچھ دنوں کے بعد وہ آموجود ہوتا ہے ۔

خوابوں کی تحقیق اور تجزیئے کے سلسلہ میں ایسے خواب معلوم ہو جاتے ہیں ۔

لیکن "ایڈیمنڈ فرائڈ" نے ایسے خوابوں کو نظر انداز کیا ہے اور بعضوں کی بعید از قیاس توجیہہ بتائی ہے ۔ لیکن میں تو ان خوابوں کی حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ قرآن پاک میں ایسے خواب متعدد درج ہیں ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ، عزیزِ مصر کا خواب ، اور حضرت یوسف علیہ السلامؑ کے دو زندانی رفیقوں کے الگ الگ دو خواب ، حضرت ابراہیمؑ کا خواب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خواب ہمارے لئے اس امر کی محکم دلیلیں ہیں کہ رویائے صادقہ بھی حق ہیں ۔ (واللہ اعلم بالحقائق)

ہمارا عروج وزوال

اپریل ۱۹۵۳ء

اوروں کی بے عملیوں کے الزامات ہمارے سر تھوپے جاتے ہیں۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس علم و روشنی کے دور میں اتنی تاریکی اور واقعات و حقایق سے اتنا بُعد ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رہبانیت کی تعلیم اور ترک عمل کی تلقین ترک دنیا کی ہدایت کاروباری عالم سے ہمیں کتنا دور پھینک سکتی ہے۔ یونان اور روم کے عروج و ترقی کی راہ میں حکمرانِ یورپ سدِ راہ ہوئے۔ طرح طرح کی مشکلیں پیدا کیں یہاں تک کہ بالآخر قوم کو ان سے بغاوت کرنی پڑی۔ اس سے تو ہم واقف ہیں۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا کہ مذہب اسلام کی تبلیغ و ہدایت بھی دنیاوی ترقی کی منافی ہے بڑا ظلم ہے۔ میں ایک عام فضا دیکھتا ہوں کہ دورِ حاضر کے نوخیز دلدادگانِ سیاست مذہب کے نام سے بدکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ نہ تو اپنی پچھلی تواریخ سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ مذہبی زندگی کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انہیں ایسی بھی نظر آتی ہے، جو دنیا و مافیہا سے بے تعلق رہتی ہے۔ وہ صوفیائے کرام کی جماعت ہے۔ یا علماء کا ایک ایسا گروہ ہے جس نے اپنا فرض منصبی محض پڑھنا پڑھانا مقرر

کر رکھا ہے۔ موخر الذکر جماعت تو آج بھی ترقی یافتہ دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہے یعنی اکثر فنون کے پروفیسر رات و دن اپنی فنی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں میں نے سر، پی۔ سی رائے سے ایک دفعہ ملاقات کی خواہش کی اور تین منٹ وقت مانگا تو انہوں نے بہت غور کر کے کہا کہ تم بہار سے کلکتہ آئے ہو اور مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ تین منٹ وقت تو میں دو ہی صورتوں میں دے سکتا ہوں ایک تو شام کے ٹہلنے کے دوران میں دوسرے لیبوریٹری کے اندر جب میں اپنے آلات کیمیائی، مرتب کرتا جاؤں گا، تم سے باتیں بھی کرتا رہوں گا۔ میں نے موخر الذکر وقت کو پسند کیا اور بجائے تین منٹوں کے ایک گھنٹے باتیں کیں۔ غرض یہ ہے کہ جب تک علم و فن میں اتنا انہماک نہ ہو کوئی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارے علماء جو اپنے علم و فضل میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ وہ درس دینے کے بعد جو اوقات ہوتے ہیں، وہ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے کم تعلق پیدا کرتے ہیں۔

دوسری جماعت صوفیائے کرام کی ہے۔ اس جماعت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سیاست کی شکست خوردہ جماعت ہے۔ کیونکہ ابتدائے اسلام میں کوئی ایسی جماعت سنی نہیں جاتی جو عمل و جہاد سے الگ رہ کر عبادت میں وقت صرف کرتی سوائے چند اصحاب صُفّہ کے جن میں اکثر معذور تھے اور بعض عشقِ الٰہی میں از خود رفتہ۔ دنیا سے علیحدگی کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی ابتدا تو اس

وقت سے وجود میں آئی جب یزید کی خلافت پر جبریہ بیعت لی جانے لگی اور حق شناس بزرگ اس فتنہ سے بچنے کے لئے شہر سے دیہات اور دیہات کی بستیوں سے پہاڑوں کے دروں میں جا چھپے۔ کیونکہ جنگ صفین کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد ان کی ہمتِ مقاومت پست ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ دورِ عباسی کے اخیر تک جاری رہا کیونکہ اس دور میں اہل بیتِ رسول کے شیدائیوں کا گزر شہروں میں دشوار ہو گیا تھا۔

میں آپ کو اس جماعت کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں جس نے عرب کے دور ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا اور جس نے روم کی بڑھتی ہوئی ترقی کو پامال کر دیا۔ جس نے ایران کی شہنشاہیت کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ جس نے نصف صدی کی مدت قلیل میں آباد دنیا کے نصف حصہ پر اپنا غلبہ قایم کیا اور ایک صدی ہوتے ہوتے فرانس سے ہندوستان اور ملایا تک اپنا سکہ بٹھلایا۔

اور یہ نہیں کہ کسی ملک پر انگریزوں کی طرح جس کی ترقی کی روشنی نے آپ کی نگاہوں کو چکا چوندھ کر دیا ہے۔ صرف سو ڈیڑھ سو برس تک کمزور سی سلطنت کی ہے اور جس نے سلطنت کا دارومدار محض حکمت عملی اور فریب پر رکھا ہو بلکہ وہ جہاں گئے وہاں جڑ گاڑ دی آپ کو یہ خیال دلا کر پست کیا جا رہا ہے کہ اسپین سے مسلمان نکال دیئے گئے۔ ہاں نکال دیئے گئے

کب نکال دیئے گئے؟ سات آٹھ سو برس کے بعد اور کب نکال دیئے گئے؟ اپنے دین سے غافل ہونے کے بعد! کب نکال دیئے گئے؟ افتراق اور جنگ باہمی میں بری طرح اُلجھنے کے بعد وہ نکال دیئے گئے۔ خدا اور رسول سے بغاوت کرنے کے بعد۔

میں آپ کو ان ہی برے دنوں سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے تیزی کے ساتھ سامنے آتے نظر آرہے ہے۔ لیکن میں انہیں روکنے سے اپنے آپ کو معذور نہیں سمجھتا۔ میں ان کو اپنی قوت ایمانی سے زیادہ قوی نہیں پاتا میں اپنے عزم اور اپنی جرأت کو سارے آنے والے خطروں پر غالب پاتا ہوں۔ بشرطیکہ آپ ہماری باتوں کو دیوانوں کی بڑ نہ سمجھیں۔ ہمارے سامنے دلائل ہیں۔ میں اصول سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں سلسلۂ عروج وزوال سمجھانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو نفسیاتی اثرات سے پاک کرنا چاہتا ہوں میں آپکے احساس کمتری کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ میں وہ اعصابی انحطاط پاتا ہوں۔ جس میں نروسس (NEROSIS) کے جراثیم نشو ونما پاتے ہیں اور بالآخر اعضاءِ انسانی کو مفلوج کر دیتے۔

میرے دوستو اور عزیز و! ہمارے طبیبِ حقیقی (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب صدیق اکبر میں خوف وہراس کے آثار پائے، تو کیا کیا وہ نسخہ مجرب استعمال فرمایا، جس کا اثر آج بھی ایک ایماندار انسان کے

اعصاب میں تناؤ اور دل میں جوش اور خون میں گرمی پیدا کرنے کو کافی ہے وہ تھا آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک فقرہ لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا نہ ڈرو اور نہ مغموم ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے لفظ "مَعَنَا" (ہمارے ساتھ) کا اطلاق ہر اس شخص اور اس جماعت پر صادق آتا ہے، جو "معھم" (ان کے ساتھ) ہے یوں سمجھو کہ جب تک ہم ان کے ساتھ ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے اور جب اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت کوئی جادو کوئی سحر ہم پر غالب نہیں آسکتا۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری ترقی کا سبب کیا تھا اور اب زوال کا سبب کیا ہے۔ گبن (GIBBON) نے مسلمانوں کے عروج کا سبب یہ بتایا ہے، کہ بانئ اسلام نے اپنے متبعین کے دل سے موت کا خوف اٹھا دیا تھا۔ لین پول (LANE POLE) نے کہا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب ان کا اتحاد ہے گلیڈاسٹن (GLADSTONE) نے کہا ہے کہ جب تک مسلمانوں میں مساوات اور رواداری ہے کوئی ان کو مٹا نہیں سکتا اور ایک دوسری جگہ کہا کہ جب تک مسلمانوں میں قرآن ہے۔ یہ قوم مٹ نہیں سکتی۔ یہ اخیر تجویز زیادہ وقیع ہے۔

دوسروں نے اسلام کو دور سے دیکھا اور اپنی عقل کے مطابق ایک رائے قائم کی، جو ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کی ترقی اور عروج کا گُر بتا دینا چاہتا ہوں۔ جس کی تفصیل فخر الدین رازی آٹھ آٹھ سو

صفحے کی آٹھ جلدوں میں پورا نہ کر سکے وہ ہیں یہ دو فقرے "ایمان اور اتباع سنت" میں دو پیراگراف میں دونوں کی تفصیل کا اختصار کر کے آپ پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں کہ واقعی محض یہی دو چیزیں ساری ترقیوں کا سبب بن سکتی ہیں کہ نہیں۔

خدا کو ماننا۔ کائنات کا ایک خالق ماننا، اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر ماننا۔ ہر چیز کا موجد اور رسبب ماننا کہ وہی مارتا ہے، وہی جلاتا ہے وہی رازق ہے، وہی مصائب کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے اشیاء میں افعال و خواص دیئے ہیں۔ وہی ان کو بدل سکتا ہے۔ وہی نیکی پسند کرتا ہے اور برائی ناپسند کرتا ہے۔ نیکوں کی مدد فرماتا، ظلم و زیادتی کو بالآخر فنا کرتا ہے، وہی قوموں کی اور افراد کی قسمت بدل سکتا ہے۔ وہی فتح دیتا ہے، وہی مغلوب کرتا ہے۔ غرض وہ قادر مطلق ہے۔ حکیم ہے داتا ہے، کوئی دوسرا اس کی قدرت میں شریک نہیں۔

اتباع سنت کیا ہے، خدا سے اتنا ڈرنا، جتنا ڈرنا چاہیئے۔ اس پر بھروسہ رکھنا، انسانوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ۔ جانوروں کے درد دکھ کا خیال رکھنا۔ محتاجوں کی مدد کرنا۔ کسی کو اپنے آپ سے نیچا نہ سمجھنا۔ بے ضرورت وقت ضائع نہ کرنا۔ جسم اور کپڑے کو صاف ستھرا رکھنا بے ضرورت کوئی عمل نہ کرنا، اسراف نہ کرنا۔ مال جمع کرنے کے شوق میں نہ پڑنا، وقت کی پابندی

کرنی۔ ہر وقت کے لئے کاموں کا مقرر کر دینا، خود غرضی اور نفس پروری سے باز آنا۔ حلال کھانا اور سچ بولنا۔

سنت کا اصل الاصول نیک عمل اور نیک اخلاق اور یہی انسانیت کا راز ہے۔ اقوام کے زوال کا سبب اخلاق کا بگڑ جانا ہوتا ہے اور نیک اخلاق پیدا ہو جانے سے قومیں بنتی ہیں۔ آپ یہ فرمائیں گے کہ بس اسی ایمان اور سنت پر عمل کرنے سے ساری دنیاوی ترقیاں ہو جائیں گی۔ عقل کے خلاف میں یہ کہوں گا کہ اس کو سچ ماننا ہی خلاف عقل ہے۔ کیونکہ عقل کے موجد عقل کے خالق اور عقل کو نشو و نما دینے والے کا بتایا ہوا یہ راز ہے۔ مجھے خدائی عقل بتاتی ہے اور خدا کے بنائے ہوئے یہ طریقے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مسلمانوں کو مصر کے قلعہ کے فتح کرنے میں دقت ہوئی، تو رسول خدا کے فدائیوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ شاید کوئی سنت ترک ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے فتح میں دقتیں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالاتفاق طے پائی کہ مسواک کرنا بھول گئے ہیں۔ چنانچہ سب لوگوں نے مسواک کرنا شروع کیا۔ مصریوں نے دیکھا کہ آج سب کے سب دانت سجا رہے ہیں، شاید آج ہمیں چبا جائیں گے۔ خوف کھا کر قلعہ خالی کر دیا یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کہاں تک خوش خیالی کو دخل ہے۔ لیکن کیا آپ اس کو محال سمجھتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے کسی عمل یا کسی نیک خیال سے خوش ہو کر ہمارے دشمن کے دل پھیر دے۔

ہمارے نوجوان کہیں گے کہ عروج و ترقی کے لئے کوئی اقتصادی پلان ہونا چاہیئے اور کسی صنعت و حرفت کی طرف قوم کو متوجہ کرنا چاہیئے، نہ کہ محض بوسیدہ اور پارینہ خیالات کو قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ میرے عزیزو کاشتکار جب کوئی فصل لگانا چاہتے ہیں۔ پہلے زمین کی تیاری کرتے ہیں، زمین کی تیاری میں جتنا وقت صرف کرتے ہیں اور جس قدر سرگرمی سے مشغول کار ہوتے ہیں۔ اس سے ہزار ہا گونا کم بیج بونے میں وقت لگاتے ہیں اس طرح قوموں کی ترقی اور عروج کے لئے پہلے اصلاحِ خیال اور اصلاحِ اخلاق کی ضرورت ہے ورنہ بہتر سے بہتر اسکیم، اعلیٰ سے اعلیٰ تدبیر بیکار ہو جاتی ہے۔ جیسے بانگر زمین میں دانہ پھینکنے سے دانہ کو ضائع کرنا ہے۔ کیونکہ زمین میں صلاحیت دانوں کو چھپانے کی نہ ہوگی، تو دانے پرندے کھا جائیں گے اور جو پرندوں سے بچیں گے وہ کیڑے کھا جائیں گے، نہ کھیت سرسبز ہوگا اور نہ فصل تیار ہوگی۔

میں نے اس زندگی میں بہت ساری تجویزیں اور ان گنت پلان دیکھے۔ لیکن کسی کو پروان چڑھتے نہ دیکھا۔ بلکہ اکثر ایسے ہوئے جن سے الٹا اثر پیدا ہوا۔ ابھی ہمارے سامنے کی مثالیں ہیں۔ ہندوستان ہی کو لیجئے۔ کانگرس نے بڑی ترقی کی، یہاں تک کہ تیس سال کی تگ و دو کے بعد ہندوستان کو غیر ملکی اثرات سے پاک کیا۔ غلامی دور کی، آزادی لی۔ لیکن آج دیکھئے گلی کوچے میں غریب انسان یہی کہتے ہیں کہ گاندھی جی کے سوراج سے انگریز راج کہیں

بہتر تھا۔ کھانے کو غلّہ اور پہننے کو کپڑا ملتا تھا۔ آج تو کھانے اور پہننے کو ترس گئے۔ بات کیا تھی زمین ہموار نہیں تھی۔

گورنمنٹ نے طرح طرح کے پلان تیار کر لئے ہیں۔ لیکن غربت بڑھتی جاتی ہے۔ سبب یہ ہے کہ افراد کی تربیت پوری طرح نہ ہو سکی۔ نفاق، عداوت، جنگ جدل، لوٹ مار، دھوکا فریب، جُوا، بلیک مارکٹنگ، رشوت، فضول خرچی، بخل، خود غرضی سارے عیوب موجود ہیں۔ ابھی چند دن ہوئے ہم نے اپنی آنکھوں سے جاپان کا اقتصادی عروج دیکھا، صنعت اور تجارت کی ایسی ترقی کہ ہندوستان میں ۵ر یا ۶ر گز وہ جھلملے اور چمکدار کپڑے گھر گھر پہنچا دیئے، جن کو دیکھ کر حیرت تھی۔ آج وہ قوم ہم سے زیادہ حقیر، ہم سے زیادہ پریشان اور ہم سے زیادہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔

جرمنی کی سائنس کی ترقی کا کیا پوچھنا ہے۔ جنگِ اعظم میں طرح طرح کے حربے نکال دیئے، وہ تیس ۳۰ من کا گولا کہ جس کی حالت سُن کر ہم ہندوستان میں سہمے جا رہے تھے۔ انگلستان والوں کا کیا حال ہوگا، خدا ہی جانتا ہے۔ یکایک التوائے جنگ ہو گیا۔ جرمن کو اخراجاتِ جنگ ادا کرنے پڑے۔ بیس برس تباہ حالی میں گذرے۔ لیکن سائنس اک چیز تھی۔ پھر دوبارہ دم خم حاصل کر لیا اور ساری دنیا سے لڑنے اور سب کو مغلوب کرنے کو تُل گیا وہ حیرت انگیز ایجادیں اور وہ روح فرسا حملے اور وہ ہمت شکن منصوبے کہ اللہ اللہ دنیا

چشم براہ تھی کہ جرمنی کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور کیا کیا اودھم مچاتے ہیں۔ مگر دیکھا یکایک کیا ہوا۔ ایٹم بم کی ایجاد بھی مکمل ہو گئی۔ لیکن جرمنی کا وقار صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ برطانیہ کا وہ عروج کہ سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا وہ حکمت عملی وہ چاپلوسی، وہ ہشیاری وہ کیا دی کہ دنیا مقابلہ کرنے سے عاری تھی۔ ان کی ہر روش پسندیدہ، ان کی ہر بات دل آویز۔ ہر ادا دلکش، اور ہر حکمت عملی عقلوں کو مفلوج کرنے والی۔ آج مصدق انہیں انگلیوں پر نچا رہا ہے اور کوئی داؤ نہیں چلا اور نہ کوئی جادو اس کے سر نہیں چڑھتا۔

آپ کیا مجھ سے یہ ہی توقع رکھتے ہیں، میں آپ کو وہی ہلکی پھلکی تدبیریں بتاؤں، جس سے چند دنوں کے تماشے دکھا کر سمیٹ لیا جائے۔ نہیں میں وہ بتاؤں گا، جس میں اصلیت ہوگی، حقیقت ہوگی، جس میں پائیداری ہوگی۔ زراعت کرو تو وہ بیج لگاؤ جو افغان کی سرزمین پر بارآور ہوا اور ہزاروں سال سے قائم ہے۔ وہ پودا جماؤ، جو ایران کی سرزمین پر اگا اور آج تک موجود ہے۔ وہ پیڑ بٹھاؤ، جو مصر میں بارآور ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ درخت اگاؤ جو عرب و شام میں جڑ پکڑ گیا ہے۔ پھیلا اور پھولا پھلا وہ کام کرو جس میں تائید غیبی شامل حال ہو۔ جس کی طاقت انسانی تدبیر و کوشش سے کہیں بلند و بالا ہو، جس کو حقیقت سے لگاؤ ہو۔

وہ کھیل کھیلو جو کھیلا جائے اس مادی مجازی چند روزہ اور مٹ

جانے والی دنیا میں اور اس کی داد ملے۔ نہ مٹنے والے، نہ بدلنے والے، ہمیشہ قایم رہنے والے عالم میں "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً" میں وہ تدبیر بتاتا ہوں جس میں دنیا و آخرت دونوں عالم کی فلاح ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ بَلْ تُؤْثِرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقَىٰ۔

میرے دوستو کیا تمہیں اس کا یقین نہیں کہ دنیا و ما فیہا اسی ایک مالک کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس پر جس کو چاہتا ہے تسلط دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے، لے لیتا ہے قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ جو دینے والا ہے، اور جو دے کر چھین لینے والا ہے۔ اس کی طرف جھکو۔ اس سے اپنے تعلقات استوار کرو۔ اس کو اپناؤ، میں اس سے بہتر اور کیا تدبیر بتاؤں۔ اس سے اچھی کون سی اسکیم پیش کروں، وہ مسبب الاسباب ہے، وہ تدبیریں سجھانے والا ہے، وہ راہیں نکالنے والا ہے، اس وقت تو مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے ساری راہیں بند معلوم ہوتی ہیں اور ساری تدبیریں مفلوج۔ اس لئے میں اسی کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں، جو قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے، جو راہیں کھولنے والا ہے، جو اسباب پیدا کرنے والا ہے۔

آپ کو مغرب کا حال معلوم ہے۔ مغرب کی پستی وہ تاریکی وہ ظلمت، وہ

دشمنی وہ عداوت، وہ خانہ جنگیاں اور قبائلی استبداد، غربت جہالت کا حال نہ پوچھئے، فردوسی نے ان کی معاشرتی زندگی کو یوں بالاختصار بیان کیا ہے:

ـــ پس از خوردنِ کرگس و سوسمار
عرب را بجائے رسیداست کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

اس پستی اور بدحالی سے عربوں کو یکایک سربلندی اور عروج تک جس تدبیر نے کھینچ کر پہنچا دیا، وہ محض طاقتِ ایمانی تھی۔ یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق۔ اپنے پچھلے دور پر نگاہ ڈالو اور موجودہ حالت سے ملاؤ اور اس تنزّل اور انحطاط کے اسباب و علل پر غور کرو، پھر جو تدبیر اور جو علاج سمجھ میں آئے اس پر ہم اور آپ سب مل کر کاربند ہو جائیں۔

بمبئی، دلی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں دیکھتا ہوں کہ ایک بٹن دبانے سے سارا گھر روشن ہو جاتا ہے۔ پنکھے بھی چل پڑتے ہیں۔ چولھے بھی روشن ہو جاتے ہیں اور ہیٹر بھی گرم۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ یکایک سارے گھر کے قمقمے بجھ جاتے ہیں۔ پنکھے بند، چولھے ٹھنڈے اور ہیٹر سرد۔ تفتیش ہوتی ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ یکایک جگمگاتے ہوئے قمقموں کی روشنی کیا ہوئی اور پنکھے بھی بند ہو گئے۔ چولھے اور ہیٹر ٹھنڈے پڑ گئے۔ پاور ہاؤس میں تو کوئی گڑبڑی

نہیں ہوئی، نہیں سڑکوں پر روشنی تو ہے۔ لامحالہ معلوم ہوتا ہے کہ کنکشن خراب ہو گیا ہے۔ یا تو عدم ادائیگی ٹیکس کی وجہ سے کمپنی نے تار کاٹ دیا، یا یوں ہی تار کمزور ہو کر ٹوٹ گیا ہے، یا تار کا رخ کسی اور طرف جا ملا۔

ان ہی اسباب میں سے کوئی سبب تھی ہوگا۔ ورنہ وہ ہماری چمک دمک، وہ شان و شوکت، وہ رعب و داب، وہ عزت و وقار یکایک کیوں مٹی میں مل گیا۔ اس خلاق عالم کا کاروبار، اپنی جگہ پر ہے، وہ قومیں جو پست تھیں، وہ جماعتیں جو گری ہوئی تھیں وہ عروج پر ہیں اور ہم مائل زوال، عرب نے تو فیکٹریاں کھول کر وہ دولت نہیں حاصل کی تھی کہ خیرات لینے والا کوئی فرد ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا تھا۔ وہ امن و سکون کہ ایران سے مدینہ تک ہاتھوں میں اشرفیاں لئے چلا جائے کوئی اس کی طرف نگاہ بھی نہ کرے۔ کہاں کی چوری اور کیسا ڈاکہ، بات یہ تھی کہ ہمارا ایمانی سلسلہ اس قادرِ مطلق سے ملا ہوا، ہمارا عمل تعلیمِ محمدیؐ کے مطابق تھا۔ اسی لئے ہماری ترقی بھی عقلوں کو متحیر کر دینے والی، ہماری طاقت، طاقتوروں کی ہمت توڑ دینے والی تھی۔

ہمارا سخن تکیہ ہو گیا ہے کہ زمانے کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ زمانہ کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ لیکن تجربہ تو یہ ہے کہ ہر زمانے کی ترقی کو پست کرنے کے لئے اس قادرِ مطلق نے ایک نیا طریقہ ایجاد فرمایا۔ قوم عاد کی بڑی بڑی عمارتوں کو منہدم اور پست کرنے کے لئے تو منجنیق یا قلعہ شکن ڈائنامائٹ

(DYNAMITE) تیار کرنا تھا۔ لیکن ایک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کردیا اور ساری عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ ثمود نے دیکھا کہ عاد زلزلے سے برباد ہوگئے۔ مکانات گر جاتے اور آدمی اس سے دب جاتے ہیں۔ اس لئے پہاڑ کے چٹانوں میں کھود کھود کر مکانات بنائے، تاکہ زلزلوں سے تباہ نہ ہوسکیں، تڑاخ کی ایک آواز پیدا ہوئی، جس سے ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ مکانات پڑے کے پڑے رہ گئے۔ موسیٰؑ کو فرعون کا مقابلہ کرنا تھا اور فرعون کے پاس تو گھوڑوں کی کثیر التعداد فوج تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو گھوڑے خریدنے تھے اور ایک فوج مرتب کرنی تھی۔ لیکن وہ کس طرح تباہ ہوا اور اس کی فوج کس طرح غارت ہوئی۔ دریائے نیل میں ڈبا دیا گیا اور پوری فوج غرق ہوکر ہلاک ہوئی۔

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں۔ روم اور ایران کی دو بڑی طاقتیں تھیں، جو آپس میں ایک دوسرے سے لڑتی تھیں، تو کبھی یہ ہارتی اور کبھی وہ بعثت کے تھوڑے دن قبل۔ دونوں میں جنگ ہوئی تھی، تو ایرانیوں نے وینس پر اس طرح قبضہ کرلیا تھا کہ نئی قسم کی کشتیاں بنائی تھیں جس پر رومی حملہ نہیں کرسکتے تھے۔ ایرانی اپنی آہنی کشتی کی ٹھوکروں سے رومی کشتیوں کو ڈبا دیتے تھے، غرض کہ دونوں کے پاس طرح طرح کے اسلحہ موجود تھے۔ لیکن جب اسلامی فوج تبوک کو روانہ ہوئی تو ادھر چند ہزار

فوجی اور بوسیدہ اسلحہ اور نہایت ناکافی رسد ساتھ لے گئے۔ اُدھر رومیوں کی فوج دو لاکھ سے زیادہ اور مسلح جس میں پیدل کم اور گھوڑ سوار زیادہ یہاں دو دو آدمیوں پر ایک سواری مشکل سے تھی۔ دو ماہ تک وہاں ٹھہرے لیکن رومیوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی اور رفتہ رفتہ تمام سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آپ کے لئے کسی منزل پر پڑاؤ نہ ڈالے گا، کہ آپ اس کی رفتار سے آگے بڑھ سکیں۔ قومیں جب آگے بڑھتی ہیں، تو اسباب غیبی سے۔

پنولین، کیوں ہار گیا، اس کے منصوبے اور اس کے سامان آپ کو معلوم ہیں، محض ایک ناگہاں بارش کی وجہ سے، جاپان اور جرمن کیوں پسپا ہو گئے، محض ایک آلۂ جنگ کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے۔ انگریز ہندوستان سے کیوں ہٹے۔ دنیا کی فضا یکایک بدل جانے کے سبب سے۔ خدا کی مشیت ایسے ایسے حالات پیدا کردیتی ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

میں آپ کو یہ ہی کہوں گا کہ وقت کا تقاضا ہے کہ آپ خدا کی طرف متوجہ ہوجائیں۔ اپنے اخلاق کی اصلاح کریں۔ امدادِ غیبی کی امید باندھ کر اپنے دل کی افسردگی اور پستی کو دور کریں۔ دنیا کو دکھا دیں کہ آپ بہترین شہری بن کر ملک و قوم کے لئے مفید ہیں۔ آپ نوعِ انسانیت کے بہترین بہی خواہ

ہیں۔ اگر دوست ہیں تو لائق اعتماد دوست ہیں اور اگر مزدور ہیں، تو کارآمد
مزدور ہیں اور اگر دشمن ہیں، تو خطرناک دشمن ہیں۔ آپ میں یہ ساری
صفتیں پیدا ہوں گی، تو اتّباعِ سنّت سے، خدا پر ایمان، اعتماد اور بھروسہ
رکھنے سے۔ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ۔

تصوّف

مئی ۱۹۵۹ء

یہ کچھ عجیب سی بات ہے کہ اس دورِ مادیّت میں، جنگ و جدل کی فضا میں سیاسی کشمکش میں پھنسی ہوئی دنیا کو تصوّف کی طرف مخاطب کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہم صدیوں سے مادّیت اور طبیعات کی طرف اپنی ساری توجہ، ساری کوشش اور پوری محویّت کے ساتھ مائل ہیں۔ ہم نے دُنیا کے ذرّے ذرّے سے اپنے عیش، اپنے آرام، اپنی ضرورت کے پورا کرنے کی کوشش کی اور بظاہر ہم اپنی سطحی کامیابیوں پر فخر بھی کرنے لگے اور سمجھنے لگے کہ کائنات کا ہر ذرہ ہمیں راحت اور آرام پہنچانے کو پیدا ہوا ہے۔ اکثر جہل کے بعد انسان کو جہلِ مرکب حاصل ہوتا ہے جس کو وہ علم سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن حقیقتہً علم کی انتہا جہل ہے۔ ارسطو نے کہا کہ اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ اربابِ عقل و فہم یہ سمجھیں گے کہ میں ہمہ دانی کا دعویٰ کرتا ہوں، تو یہی کہہ دیتا کہ میں کچھ نہیں جانتا اور جب ابوشکور بلخی

نے کہا:

تا بجائے رسید دانش من
کہ بدانم ہمی کہ نا دانم

تو علمائے وقت نے اس پر اعتراض کیا کہ یہ دعویٔ ہمہ دانی ہے۔ کیونکہ نہ جاننے کا علم اسی کو حاصل ہو سکتا ہے، جو سب کچھ جان لے۔ اس کو آپ یوں سمجھیں کہ پہلے چیزوں کے وجود کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بعد اس کے اس کی حقیقت کا علم۔ یہ تو امرِ مسلّم ہے کہ دنیا کی کسی چیز کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے جان لینا ضروری ہے کہ چیزیں کیا ہیں۔ ایک بچّے نے نہایت مسرور ہو کر مجھ سے کہا کہ میں نے تو آج سب کچھ پڑھ لیا اور وہ اس روز حروف تہجی "ی" تک پڑھ چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ "الف" سے "یے" تک پڑھ لینا ہی سب کچھ پڑھ لینا ہے۔ کیونکہ اُسے یہ نہ معلوم تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے اور پڑھنے والے کو کیا کیا پڑھنا ہوتا ہے۔ مجھ کو تو یہ معلوم ہے کہ دنیا کے پڑھنے والے کچھ نہ پڑھ سکے۔ علم کے طالبوں کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ اور علم الاوّلین و علم الآخرین حاصل ہوا تو ایک اُمّی کو۔ چار سو برس کی کوششوں کے بعد انسان ہوا پر اڑ سکا تو اس نے اس کو اپنا بہت بڑا کارنامہ سمجھا۔ میں تو جانتا ہوں کہ رَبِّ ھَبْ لِیْ مُدُکًا لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ نَعْدِیْ کے چھوٹے سے فقرے نے کیا کیا کمالات دکھلائے۔ ہوا پر اڑنا یا چشم زدن میں بلقیس کا مع تخت

دور دراز ملک سے اپنے سامنے منگا لینا معمولی کرشمہ تھا۔

ایک حقیقت شناس نظر کے سامنے انسان کی ساری کوششیں اور بلند پروازیاں ویسی ہی معلوم ہوتی ہیں جیسے لڑکوں کا کھیل۔ وہ کبھی کسی درخت کی شاخ کو زمین میں گاڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم درخت لگا رہے ہیں کبھی دانوں کے بجائے پیسے مٹّی میں گاڑتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیسے بو دیئے ہیں یہ پھلیں گے۔ ازیں قبیل اپنے بھولے پن میں ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں جس پر ایک سمجھ دار کو ہنسی آتی ہے۔ اسی طرح میں دیکھتا ہوں کہ انسان مادّیات میں محو ہے اور نتائج سے بے خبر۔

تصوف کیا ہے، حقیقت کی طرف مائل ہونا۔ مجازات سے بے اعتنائی برتنا۔ اس کا کمالِ معرفت، توکّل اور تفویض ہے۔ جب انسان اپنی کوششوں سے تھک جاتا ہے، تب یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انسانی طاقت سے بالا کوئی طاقت ہے اور اس کے بعد اپنی مجبوری اور اس بڑی طاقت کی ہمہ گیری کا علم ہوتا ہے اور بتدریج یہ علم یقین کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان تمام معاملات میں اس بڑی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اسی بھروسہ کرنے کو توکّل کہتے ہیں اور اپنے تمام مہمات اسی کو سونپتا ہے جسے تفویض کہتے ہیں۔

مسلمانوں میں تصوف کا وجود دوسری صدی ہجری کے قبل معلوم نہیں ہوتا ہے۔ پروفیسر نکلسن اور پروفیسر براؤن نے مختلف اقوال درج کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ

تصوف ویدانت کے اصول پر مبنی ہے۔ کسی کے نزدیک مانیانی فلسفے پر اسلامی تصوف کا مدار ہے۔ بعضوں کے نزدیک بودھ مذہب اس کا مخرج ہے اور اکثر یہ کہتے ہیں کہ نصرانیوں کی رہبانیت کی یہ دوسری شکل ہے۔ ان خیالات کی تاریخی حیثیت اور معقولیت پر تو میں آگے چل کر روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہاں پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ویدانت کیا چیز ہے اور اس کا تخیل کیونکر پیدا ہوا۔

آپ کو معلوم ہے شری کرشن جی نے اپنی جوانی کے دور میں نہایت پُر لطف محبت اور پریت کی زندگی بسر کی۔ اس کے بعد جوان ہوئے، تو مہابھارت کا معرکہ پیش آیا۔ اس مہابھارت کے کشت و خون اور مہیب منظر نے ان کے سامنے دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی کشمکش کی پریشانیوں کو نمایاں کر دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ کسی ایسی حقیقت کی طرف دعوت دیتے جو سراسر راحت، امن اور سکون ہے۔ اس لئے انسان کی رہنمائی کے لئے گیتا اور اس کا فلسفہ پیش کیا۔ اسی طرح جب اردشیر مانی کا مخالف ہوا اور اس کو ایران سے چین کی طرف بھاگنا پڑا تو وہاں جا کر ارژنگ چین میں اصلاح خیال اور اخلاق کی تصویریں پیش کیں اور گوتم بدھ نے جب اپنے دورانِ حکومت میں ظلم، تعدّی، خودغرضی، مردم کشی کے مناظر دیکھے تو اس نے تنگ آ کر ساری چیزوں سے دست برداری عمل میں لائی اور کسی ایسی حقیقت کی تلاش شروع کی جس سے انسان کو امن و سکون حاصل ہو اور پھر اپنا فلسفہ نروان

(NIRVAN) اور آہنسا (AHINSA) پیش کیا۔ نصرانیوں کے سامنے جب صلیب کا حادثہ جاں فرسا واقع ہوا، تو حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے رہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم جاری کی۔ جنگ صفین کے قبل ہمارے مولا علیؓ نے جو بدر، حنین اور غزوہ خیبر میں اسداللّٰہی کی شان دکھاتے رہے۔ جب مسلمانوں کے ہاتھ سے مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہتے اور کلام اللہ کو فریب اور تزویر کا آلۂ کار بنتے دیکھا تو تعلیم روحانی کی طرف خاص توجہ فرمائی۔ واقعۂ کربلا کے ہوش رُبا منظر نے مسلمانوں کے دل، دنیا اور انتظامِ دنیا کی طرف سے پھیر لئے۔ یوں تو اسی وقت سے جب یزید کی بیعت کی دعوت شروع ہوئی۔ صحابۂ کرامؓ شہروں سے دیہاتوں اور پہاڑ کے دروں کی طرف جا کر گوشۂ نشین ہو چکے تھے۔ لیکن جب سلطنت عباسیہ کے دور میں بھی فاطمیوں کے لئے دنیا تنگ نظر آنے لگی، تو مسلمان کثرت کے ساتھ ترکِ دنیا اور خلوت نشینی کی طرف راغب ہو گئے، خانقاہیں بن گئیں۔ وِرد و وظائف کا دور چلنے لگا اور فتنۂ چنگیزی کے بعد تو سوائے حلقہ مراقبہ کے کوئی چارہ کار ہی باقی نہ رہا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ حضرت معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ نے سارے کاروبار سے دست بردار ہو کر تصوف کی راہ اختیار فرمائی۔

اب آپ بتائیں کہ آج جب سائنس کی ہلاکت آفرینی یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مرغی کے انڈے کے برابر بنے ہوئے گولے سے نوبیل کے دائرے کی تمام

جاندار اور بے جان چیزیں فنا ہونے لگیں اور ہر ملک میں اٹیمک انرجی (ATOMIC ENERG) کی تحقیق و تفتیش میں ادارے اور لائبریریاں قائم ہو گئیں، تو میں آپ کو کیا صلاح دوں۔ سوائے اس کے کہ ہم آپ سے اُسی ایک قادرِ مطلق کی طرف متوجہ ہو جائیں جو اٹیمک (ATOMIC) اور اس سے زیادہ قوی طاقتیں جو وجود میں آنے والی ہوں سب کا خالق ہے اور جس کی طاقت تمام طاقتوں سے بالا ہے۔ اس لئے میں آپ کے سامنے تصوّف پیش کرتا ہوں۔

علامہ ابن خلدون نے تصوف پر مدلّل بحث کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ لفظ تصوف کا مادّہ صوف ہے، جس کے معنی اُون ہیں، اس لئے تصوف کے معنی اونی لباس پہننا ہے۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ جو لوگ خدا کی یاد اور اس کی وُلا میں محو رہتے تھے وہ عموماً کمبل اوڑھا کرتے تھے اور دُنیاوی معاملات سے کنارہ کش رہتے تھے۔ فارسی میں لفظ پشمینہ پوش ٹھیک اسی معنی میں مشتمل ہے۔ پروفیسر نکلسن نے جرمن کے ادیب نالڈک کے ساتھ اتفاق کیا جن کو علامہ ابن خلدون کی رائے سے اتفاق ہے اور پروفیسر نکلسن، پروفیسر میکڈونیلڈ (MACDONELD) کو بھی اپنی رائے کے اسناد میں پیش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پروفیسر میکڈونیلڈ نے علوم مشرقیہ کی تحقیق و تفتیش میں بہت کاوشیں کی ہیں۔ لیکن انہوں نے اس لفظ کے مادّے کے متعلق کوئی بحث

نہیں کی ہے سوائے اس کے کہ انہوں نے تواریخی پہلو اختیار کیا ہے۔ پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ یونانی لفظ "سوفی" جس کے معنی خیال یا اصلاحِ خیال ہے۔ اس کو تصوف سے کوئی مناسبت نہیں۔ کیونکہ عربی میں وہ "س" سے لکھا جاتا ہے۔ جس سے لفظ فلسفی یا فیلوسفی بنایا گیا ہے اور "صوفی" ص سے لکھتے ہیں اور نہ لفظ تصوف کو "صفا" سے کوئی تعلق ہے اور نہ "صفّہ" سے اگرچہ خود صوفی اپنے کو اہلِ صفہ سمجھتے ہیں، یا تبع "اہل الصفّہ" تصوّر کرتے ہیں۔ کیونکہ اربابِ صفّہ میں وہ لوگ تھے، جو اسلام کے ابتدائی دور میں جدوجہد، غزوہ و جہاد سے الگ تھلگ محض خدا ہی کی یاد میں مشغول رہتے تھے اور جن کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم تقسیم غنیمت کے وقت مجاہدوں میں شمار کر کے حصّہ دیتے تھے۔ کیونکہ وہ ہر وقت جہاد بالنفس میں مشغول رہا کرتے تھے۔ مسعودی نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں حضرت سلمان فارسیؓ اور ابو عبیدہ بن جرّاح کا ذکر کرتے ہوئے اُن کی خصوصیات میں سے پشمینہ پوشی اور خرقہ پوشی کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس دَور کے اکثر بزرگ اور خود حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت عمرؓ بھی کمبل اوڑھا کرتے تھے اس کی سند میں خود کلام اللہ شاہد ہے'۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کو "مزمّل" اور "مدثّر" کہا گیا ہے۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ ان بزرگوں کو کبھی صوفی نہیں کہا گیا، جس سے ہم یہ سمجھیں کہ کمبل پوش یا خرقہ پوش ہونا، صوفی ہونے کی

دلیل ہے۔ بہر حال لفظ تصوّف کا مادہ "ص و ف" ضرور ہے اور جب یہ لفظ صوف اسم جامد ہوتا ہے، تو اس کے معنی 'اُون' ہوتا ہے۔ لیکن "تفعل" فعل کا وزن ہے اور عموماً اس کا مادہ فعل ہوتا ہے۔ اس لئے میری تحقیق یہ ہے کہ تصوف کا مادہ صَوف ہے۔ جس کے مصدری معنی "تیر کا ایک طرف جھک کر چلنا" یا کسی چیز کو "عیب یا شر سے پاک کرنا" ہیں۔ اس لحاظ سے تصوّف کے معنی "ایک طرف جھک جانا" یا "نفس کو عیب و شر سے پاک کرنا" ہیں۔ (لسان العرب) اب لفظ تصوّف سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ حقیقت و مجاز کے درمیان رہ کر حقیقت کی طرف میلان پیدا کرنا ہے۔ مسلمان کسی وقت بھی دنیا ترک نہیں کر سکتا، کیونکہ ہمارے ہادیٔ برحق نے لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الدِّيْنِ فرمادیا ہے۔ یعنی دین اسلام میں ترک دنیا جائز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں یہ عرض کردوں کہ دین اسلام کیا ہے۔ ہمیشہ اس کے متعلق عوام الناس میں غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ کسی نے یہ سمجھا کہ خدا کی وحدانیت اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کی رسالت کا یقین کرنا ہی مسلمان بن جانا ہے اور ایک جماعت نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ عبادت یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج بھی لازم ہے۔ جس نے خدا کی وحدانیت کو مان لیا، رسولوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لایا اور روزِ قیامت پر ایمان لایا اور عباداتِ اربعہ ادا کرتا رہا، وہ مومن اور مسلم سب کچھ ہو گیا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلام ایک نظامِ زندگی کا نام ہے۔ جس میں اپنے حقوق خدا کے حقوق، یگانوں کے، ہمسایوں کے، شہر والوں کے، ملک والوں کے، عام انسانوں کے، حیوانوں کے، اور اللہ کی تمام مخلوقات کے حقوق بھی ادا کرنے ہیں، جس کی صراحت قرآن پاک اور احادیث نبویؐ میں موجود ہے اور جس کا قانون شریعتِ حقہ ہے۔ کیونکہ یہی تو رہبانیت ہے کہ انسان محض خدا کی عبادت میں مشغول رہے اور دوسروں سے علیحدگی اختیار کرے۔ جس کی رسولِ خداؐ نے ممانعت فرمائی ہے" ؎

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست
بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

اس وقت اس کا موقع نہیں کہ میں عبادت اور حقوق و فرائض کی بحث چھیڑ دوں۔ کیونکہ یہ بجائے خود ایک طویل مبحث ہے۔ عرض کرنا صرف اتنا ہے کہ حقیقت و مجاز کے درمیان رہ کر حقیقت کی طرف میلان پیدا کرنا ہی تصوف ہے۔ اربابِ تصوّف میں بہت کم ایسی ہستیاں ہیں، جنہوں نے تمام تعلقاتِ دنیاوی ترک کر دیئے ہوں۔

اس دَور کا تصوف کچھ اور ہی ہے۔ حقیقت سے ہٹ کر مجاز کی طرف میلان پیدا ہو گیا ہے۔ کوئی مسلمان ایسا نہیں ہے، جس کو یہ کہا جا سکے کہ وہ دین سے منحرف ہے۔ لیکن ہم میں کوئی ایسا بھی نہیں ہے، جو دین کے مقابلے میں دنیا کی

طرف زیادہ مائل نہ ہو۔ ہم نے جو معنی بیان کئے ہیں، اس کے اعتبار سے' تو وہ
بھی صوفی ہیں، جو دنیا کی طرف مائل ہیں۔ لیکن اصطلاحاً تو صوفی انہیں کو کہا
گیا ہے، جو مجاز کے مقابلے میں حقیقت کی طرف زیادہ مائل ہوں۔ بلکہ یہ
میلان کمال تک پہنچتے پہنچتے محویت تک پہنچ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ حق حق
کا نعرہ لگانے والے' انا الحق' کہنے لگتے ہیں۔

بعض مغربی فلاسفروں کی رائے ہے کہ اسلام کا تصوف افلاطونی فلسفۂ
الہیات سے مستعار ہے، کیونکہ اصل الاصول اُس کا بھی وحدت الوجود ہے اور
اس کا بھی۔ کہا جاتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں جب یونان سے مستشرقین نکالے
گئے' اور ان پر شہنشاہ جسٹینین کے مظالم ہونے لگے، تو انہیں ایران میں پناہ ملی
اور ان کی کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ کی گئیں۔ ہارون الرشید کے لڑکے
مامون کے زمانے میں یونانی فلسفہ اسلامی درس گاہوں میں داخل ہوا جس
کی وجہ سے افلاطونی فلسفۂ وحدت الوجود کے اثر سے انکار کرنا صحیح نہ ہوگا۔
لیکن یہ خیال کہ فلسفۂ اسلام پر مانیانی تخیل کا اثر ہے' ثابت نہیں ہو سکتا۔
کیونکہ پروفیسر براؤن بھی اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ پہلوی ادبیات اور
خاص کر مذہبی کتابوں کے ضائع ہوجانے کی وجہ سے اس کا پتہ لگانا محال ہے۔
علاوہ بریں مانی کے متعلق الیعقوبی نے لکھا ہے کہ مانی حماد کا لڑکا تھا جس نے
شاپور کو اپنے نئے مذہب کی طرف دعوت دی جس میں دُو خدا کا تخیل تھا اور

اس کو اپنے قدیم مذہب زردشتی سے منحرف کرنا چاہا اور شاپور اس کی طرف مائل
ہو گیا۔ الیعقوب نے مانی کو زندیق بھی لکھا ہے۔ پروفیسر براؤن کی رائے ہے
کہ لفظ زندیق لفظ صدیق سے منتقل ہو کر بن گیا ہے، میرے خیال میں پروفیسر
براؤن نے یہاں پر دھوکا کھایا ہے۔ لفظ "صدیق" کا منتقل ہو کر "زندیق"
بننا بہت دشوار ہے۔ درحقیقت یہ لفظ "ژندیک" کا معرب بنایا گیا ہے۔
"ژ" کے دُو نقطے کم کرکے "ز" داخل کیا گیا اور "ک" کو محض معرّب بنانے
کے خیال سے "ق" کر دیا گیا اور "ژندیک"۔ "ژندی" کی تحقیر ہے اور
"ژندی" نسبت ہے "ژند" و "پاژند" کی طرف جو مذہب زردشتی کی
معتبر کتابیں ہیں اور دُو خدا کا تخیل بھی زردشتی تخیل ہے۔ ایزد اور اہرمن'
دُو کا تخیل اسلام کی توحید کے متضاد ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ اسلامی تصوف کو
زندیقی فلسفے سے کوئی تعلق پیدا ہو سکتا ہے' بعید از قیاس ہے۔

اس امر کے مان لینے میں کوئی دشواری نہیں کہ اسلامی فلسفے کا تعلق
نصرانی عقیدے سے ہے لیکن نویں صدی عیسوی تک فلسفے کے اصول نصرانی'
گرجاؤں میں لامعلوم تھے۔ خود پروفیسر براؤن کہتے ہیں کہ مغربی علاقے میں
تصوف مسلم بن محمد ابوالقاسم مغربی اندلسی کے ذریعے ۱۰۰۴ء یا ۵۰۰ھ میں
پہنچا اور ابن رشد نے اس کے بعد اس کو زیادہ روشن کیا۔ (ENCYCLOPA-
DIA BRTANICA) میں درج ہے کہ ۱۰۹۶ء اور ۱۱۴۱ء کے درمیان

سینٹ برنارڈ (SENT BURNARD) نے جو (HAGH OF VECTOR)
کا ہمعصر تھا، فلسفۂ تصوف کو پھیلایا اور اغستانی خانقاہ جو پیرس کے نزدیک
(Gd. VICTOR) میں قائم تھی بارہویں صدی عیسوی میں تصوف
کا مرکز بن گئی جس نے مادیت کی طرف مائل ہونے والے پادریوں کو حقیقت
اور روحانیت کی طرف مائل کر دیا۔ لوگ دین داری کی طرف مائل ہو گئے
اور سادہ زندگی کے مداح، چنانچہ (NEITHER LAND) میں (بقائن)
(BEQAYN) اور اطالیہ میں (BETIGARD) (تبغرد) اور جنوبی فرانس میں
(WALDANES)، فلسفۂ تصوف کے حامی پیدا ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ
جب مسلمانوں کا اقتدار جنوبی فرانس تک پھیلا ہوا تھا اور اسپین علوم وفنون
کا مرکز بنا ہوا تھا۔ پروفیسر براؤن بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ مسلمانوں
ہی نے یورپ کو اس قیمتی دماغی سرمایہ سے بہرہ اندوز کیا۔ میں یہ کہہ
چکا ہوں کہ (GT. BARNEND) ہی نے پہلے پہل یورپ کے گرجاؤں
کو روحانیات سے آشنا کیا۔ انہوں نے سب سے پہلے ایک کتاب
(PRIVATC DEVOTION) یعنی تخلیہ کی عبادت لکھی۔ اس امر کے
جاننے کے بعد کہ سینٹ ایڈورڈ برنارڈ (ST. EDWAIRD BERN-
RD) الحمرا یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے اور عربی زبان اچھی طرح جانتے
تھے۔ یہاں تک کہ انگلستان کی کسی یونیورسٹی میں عربی زباندانی کے پروفیسر

بھی رہ چکے تھے کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ ان کے معلومات کا سرچشمہ اسلامی ہی
درس گاہ تھا۔

پروفیسر گولڈرس (GOLDERS) حضرت ابراہیم بن ادہم کے ترک
سلطنت اور صحرا نوردی کو گوتم بدھا کی تقلید بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں
کی تسبیح بھی گوتم بدھ کے مالے کی نقل ہے۔ لیکن یہ نہ بتا سکے کہ آخر گوتم بدھ
کی تقلید کا ذریعہ کون سا وجود میں آیا۔ نکلسن (NICHOLSON) نے
یہ رائے ظاہر کی ہے کہ حضرت بایزید بسطامی'' کو ان کے پیر ابو علی سندھی کے
ذریعے سے بدھ کا فلسفہ نروان (NIRVAN) اور خود فراموشی، بے خودی،
یا فنا فی الٰہی پہنچا۔ لیکن قبل اس کے کہ ہم اس کے متعلق کچھ اور دریافت کریں۔ یہ
دیکھنا ہے کہ گوتم بدھ نے خدا کے وجود کے متعلق کیا عقیدہ ظاہر کیا ہے۔ بدھ کی
تعلیم نیستی میں فنا ہو جانا اسلام کے فناء فی اللہ ہو جانے یا افلاطونی فلسفۂ وحدت
الوجود یا ویدانت کے ایک وحدت میں ضم ہو جانے کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ
یہاں تو بجائے نیستی کے ہستی میں فنا ہو جانا ہے اور وہ بھی وہ ہستی جو نیستی
سے قطعًا پاک ہے۔

اِن بحثوں سے قبل یہ دیکھنا تھا کہ اسلام کی اصل تعلیم کے اندر یعنی کلام
پاک اور حدیث نبویؐ میں تصوف کے اہم مسائل صراحتہً یا کنایتہً موجود ہیں کہ نہیں
مثلاً مسئلہ فنا فی اللہ کے متعلق کوئی نص قطعی موجود ہے یا نہیں۔ یہ حدیث قدسی ہے

کہ جب میرا بندہ مجھ سے نوافل کے ذریعے تقرب چاہتا ہے تو میں اس سے محبت کرتا ہوں اور جب میں محبت کرتا ہوں تو میں اس کا کان ہو جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھیں بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کا پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہی تو فنائیت کی آخری منزل ہے۔ اس طرح کی حدیثیں اور قرآن شریف کی آئتیں بہتری موجود ہیں، جن پر فلسفۂ تصوف کا دار و مدار ہے۔ آگے چل کر میں ان میں سے چند پیش کروں گا۔

جیمس ہسٹنگ (GAMS HASTING) نے ENCYCLO PAD-EA OF RELIG ON) میں لکھ دیا ہے کہ بدھ مذہب میں تصوف سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اسلام کے رو سے تصوف ایک واجب الوجود ہستی میں فنا ہو جانا ہے۔ عام اس سے کہ وہ ہستی متشخص بالذات ہو یا نہ ہو۔ اسلام اور نصرانیت میں وہ ہستی متشخص بالذات ہوتی ہے اور افلاطونی فلسفۂ وحدت الوجود میں متشخص بالذات نہیں ہوتی اور چونکہ گوتم بدھ کے نزدیک کسی ذات واجب الوجود کا تخیل ہی نہیں موجود ہے۔ تصوف کی نسبت بدھ مذہب کی طرف نرا اتہام ہے۔

یورپ کو اور یورپ کے ارباب علم کو مسلمان اور اسلامی خیال و عقیدت سے سیاسی اور اقتصادی بنا پر عناد ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی ہر اچھی چیز اور اسلام کی ہر اچھی تعلیم کی نسبت دوسروں کی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے اسلامی

تصوف کی نسبت کبھی گوتم بدھ کی طرف کرتے ہیں، کبھی گیتا کی طرف اور کبھی افلاطون کی طرف۔ حالانکہ خود قرآن مجید کی بیشمار آئتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ خدا یا وہ ذات واجب الوجود تمام کائنات کی خالق ہے، انسان سے قریب ہے انسان کے رگ و پے میں ساری ہے اور یہی اصل بنیاد ہے فلسفہ تصوف کی۔

صوفی کے لئے لازم ہے کہ معرفت حاصل کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ "معرفت پہلے اپنی ذات سے شروع ہو کر اس واجب الوجود تک پہنچتی ہے، جو تمام عالم کا خالق ہے اور جو تمام تغیرات اور انقلابات سے پاک ہے۔ یہ مثل مشہور ہے کہ ہر درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، ہر انسان اپنے عمل سے اور ہر دوا اپنے خاصے سے۔ اسی طرح ہر علت اپنے معلول سے اور خالق اپنے مخلوق سے۔ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ ہر شئے کی علت اور غرض دریافت کرے اور یہی صفتِ انسانی انسان کو دوسرے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ یعنی یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھے اس کے متعلق یہ دریافت کرے کہ یہ کیا ہے! کس لئے ہے! اور کیونکر وجود میں آئی۔ یہی جذبہ تمام تفتیش اور تحقیق، ایجاد و اختراع کا موجب ہے۔ قبل اس کے کہ ہم کسی اور چیز کی حقیقت، علت، یا غرض دریافت کریں، اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ابتدا اس کی ایک تحیر اور استعجاب سے ہوگی۔ لیکن انتہا معرفت اور ایقان تک پہنچے گی۔

اسی طرح سے اربابِ معرفت نے اپنی منزلیں طے کی ہیں۔

انسان سب سے زیادہ اپنی ذات کو جانتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ اپنی حقیقت سے ناواقف ہے۔ مگر اتنا ضرور جانتا ہے کہ وہ اپنے وجود کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں کسی دوسری ہستی کا محتاج ہے۔ اس لئے اس کو بیک وقت اپنی مجبوری اور اپنے خالق کی قوت و کمال کا ادراک ہوتا ہے اور اپنے آپ کو اس ذات سے وابستہ سمجھنے لگتا ہے۔ رفتہ رفتہ دنیا کی ساری چیزوں سے مغائرت پیدا ہو جاتی ہے اور ہر چیز کو اپنے لئے بے کار سمجھنے لگتا ہے۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو (نوافل کے ذریعے مجھ سے تقرب چاہتا ہے۔ میں اس کے کان ہو جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، یا میں اس کی آنکھیں ہو جاتا ہوں، جس سے وہ دیکھتا ہے یا میں اس کے ہاتھ ہو جاتا ہوں، جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، یہی درجہ فنائیت ہے۔

ہم آپ دنیا میں طاقت چاہتے ہیں یا اختیار چاہتے ہیں، اعزاز چاہتے ہیں اور رات دن انہی چیزوں کے حصول کی کوششوں میں مشغول رہتے ہیں۔ لیکن وہ طاقت و اختیار جو ہم دنیوی تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں، اول تو وہ تدبیریں ناقابل اعتبار ہوتی ہیں اور اس سے حاصل ہوئے کمالات ناپائدار ہوتے ہیں۔ مجاز سے جو شے پیدا ہو سکتی ہے، وہ مجازی ہی ہوتی ہے اور حقیقت سے حقیقت۔ اس ذات حق کے اتصال سے جو قوت اور جو کمال حاصل ہوتا ہے

اس میں بقاء اور دوام ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا وجود روح اور مادہ کا مجموعہ ہے۔ مادّے کا تعلق عالم ظاہر سے ہے اور روح کا عالمِ باطن سے جسم سے جب روح الگ ہو جاتی ہے، تو جسم فنا ہو جاتا ہے۔ اس جسم کو ذات سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔ بخلاف اس کے جسم سے الگ ہونے کے بعد بھی روح فنا نہیں ہوتی اور ہمارا عقیدہ ہے کہ روح۔ عالمِ ارواح میں اپنے خصوصیاتِ ذاتی کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ نیکوکار انسان کی روح علّیین اور بدکار کی سجّین میں۔ علّیین میں اعمال کے اثر سے راحت اور سجّین میں بدکاری اور معصیت کی وجہ سے عذاب ہوتا ہے۔ جسم پیوندِ خاک ہو جاتا ہے۔ روح قیامت تک اور قیامت کے بعد بھی موجود رہے گی۔ کیونکہ مقام جنت ہو یا دوزخ اہلِ جنت کے لئے بھی خَالِدِیْنَ فِیْہَا کا حکم ہے اور اہلِ دوزخ کے لئے بھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ روح ابدی ہے۔ کیونکہ روح کو اَمْرِ رَبِّیْ فرمایا گیا ہے۔ اگرچہ جسم اور روح دونوں کا مبداء وہی ذات ہے۔ لیکن روح کی نسبت اپنی طرف کی ہے اور جسم کی نہیں۔ اس تقریر سے میرا منشا یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسی طاقت موجود ہے۔ جس کی نسبت اس ذات ابدی کی طرف ہو چکی ہے اس لئے یہ کس قدر ہماری نادانی ہو گی کہ ہم عالم فانی میں محو ہو کر اپنی اس طاقت سے کام نہ لیں، جس کو بقاء و دوام ہے۔

مادہ پرست انسان بھی اب ہر چیز کے اِسنس اور جوہر کی طرف مائل ہو
گئے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر چیز کا جوہر اور اس کی روح ہی ہماری
ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔ اس لئے میں نے آج ان کو یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ
انسانی ترقیوں کا دارومدار بھی روحانی ہی ترقی ہے۔ تاریخ کے صفحات
شاہد ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی روحانی ترقی کے دَور میں سیاسی اور مادی ترقیاں
بھی کتنی سرعت اور استحکام کے ساتھ کیں۔ آج کی ترقی یافتہ قوموں سے کسی طرح
روم اور ایران کی سلطنتیں اس دَور میں کم ترقی یافتہ نہ تھیں۔ لیکن سارے
ساز و سامان، سرمایہ اور اسلحہ، بادیہ نشیں عربوں کے مقابلہ میں بیکار ثابت
ہوئے۔ اب اس کا وقت نہیں کہ میں آپ کو ان مادی انتظامات کی طرف
متوجہ کروں، جن میں ہمارے حریف بہت دُور نکل چکے ہیں۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ تصوّف اور روحانیت کی طرف
متوجہ ہو کر دیکھیں کہ آپ تھوڑی جد و جہد میں کتنی بڑی ترقی کر سکتے ہیں
جس کا مقابلہ مادیات سے نہیں ہو سکتا ہے۔ تصوف حقیقت کی طرف مائل
کرتا ہے، مادیت مجاز کی طرف۔ یہ ہماری پستی ہے، ہماری تنزلی ہے۔ ہمارا زوال
ہے کہ ہم حقیقت سے منحرف ہو کر مادہ اور مجاز کو اصل الاصول سمجھنے لگے۔ لیکن
مشکل یہ ہے کہ ہم اپنے حواسِ ظاہر سے حقیقتِ باطنی کا انکشاف نہیں کر
سکتے۔ اس لئے ہمیں ان روحانی طاقتوں کو بڑھانا ہے، جن سے باطن کا ادراک

کر سکتے ہیں۔

میں اپنے اس چھوٹے سے مضمون میں آپ کے سامنے محض لفظ تصوف
کے متعلق کچھ خیالات پیش کر سکا۔ لیکن اس کے صحیح علم۔ اس کے مباحث۔ اس
کے اعمال اور اعمال کے نتائج اور ان کے فوائد بیان کرنا باقی ہے۔ انشاء اللہ
تعالیٰ کسی دوسرے موقع پر ان کو پیش کروں گا۔ لیکن میں تو اس کی اہلیت
نہیں رکھتا کہ طریقِ عروج منازل بتاؤں یا انکشاف حقائق کرا سکوں۔

ع   ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(هُوَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ)

لیکن میں آپ کو کبھی وہ تصوف یا وہ عمل نہ بتاؤں گا، جس کا نتیجہ ترکِ دنیا
ہے اور جس کے حصول کے لئے خلوت نشیں ہو جانا پڑے۔ بلکہ میں وہ اسلامی
تصوف بتاؤں گا، جس سے دین و دنیا دونوں حاصل ہوں۔ جس پر نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بسر فرمائی اور جو صحابۂ کرام کا معمول رہا۔
اور جس کا لب و لباب رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْآخِرَۃِ
حَسَنَۃً ہے اور جس کا مقصد دونوں عالم کی فلاح و بہبود ہے۔ جس کے
سامنے قیصر و کسریٰ سرنگوں تھے۔ (ھو المستعان)

آسمانی دنیا

اپریل ۱۹۶۳ء

یاد آتا ہے کہ غالباً ۱۹۲۲ء میں کسی پرچہ یا اخبار میں دیکھا تھا، کہ فرانس کے ماہرینِ فلکیات نے یہ انکشاف کیا ہے کہ جتنے ثوابت ہیں، وہ ہر ایک کسی نظام شمسی کے آفتاب ہیں۔ آفتاب کی روشنی ذاتی ہے، اس لئے وہ بہت دوری سے بھی نمایاں ہے اور اس کی چمک انسان کو بغیر کسی دُوربین کے بھی نظر آتی ہے اور سیّاروں کی روشنی مستعار ہے۔ اس لئے وہ نظر نہیں آتے۔ یعنی سیارے آفتاب کے عکس سے چمکتے ہیں اور سورج اپنی روشنی سے چمکتا رہتا ہے۔ علاوہ اس کے سورج سیّاروں سے کئی ہزار گنا بڑا ہے، اس لئے دور سے نظر آتا ہے مگر ان آفتابوں کے بعض سیّارے دوربین کے ذریعہ سے دیکھے جاتے ہیں، اس کا بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ ان سیاروں میں حرکت ہے اور اپنے آفتاب کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں، کبھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض تارے غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ دنوں کے بعد پھر نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ اس کا محور اتنا بلند ہے کہ اس کی انتہائی بلندی سے ہم لوگوں کو نظر نہیں آتا اور جب نیچے کی طرف آتا ہے تو نظر آنے لگتا ہے، بعض غائب ہو جانے کے بعد پھر نظر نہیں آتے، بعض آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تباہ ہو گئے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ

ان کی قیامت ہوگئی۔

اب سنا جاتا ہے کہ کہکشاں میں جتنے تارے ہیں، وہ الگ الگ چاند تاروں سے آباد دنیائیں ہیں، ستارے، جو نظر آتے ہیں وہ تو ہوں گے آفتاب ہی اور ان کے ساتھ ایک نظام شمسی ہوگا، کیونکہ ابھی تک ایسا تو نہیں سُنا گیا کہ ایک دنیا الگ سے ہو اور اس کا تعلق کسی نظام شمسی سے نہ ہو۔

غرض یہ ہے کہ دنیائیں بہت ہیں، جن کا شمار کرنا مشکل ہے، حیرت تو مجھے ان اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں پر ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ معلومات اسلامی معلومات سے بالاتر ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ کہنا کہ قرآن کریم خدا کی کتاب ہے اور رسول اکرمؐ خدا کے بھیجے ہوئے نبی ہیں اور خدا کی باتیں انسانوں تک پہنچانے کی غرض سے مبعوث ہوئے تھے، غلط ہے کیونکہ خدا کی کتاب یا خدا کے پیغام میں ان باتوں کا ہونا لازمی تھا، مگر موجود نہیں ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کی کتاب اور خدا کے پیغامات کی طرف توجہ کون کرتا ہے۔ کچھ غریب مسلمان ایسے ہیں، جو قرآن اور حدیث کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہیں اور انہی کاموں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو اپنے حساب و کتاب کی فکر ہے، قیامت کے دن کا خوف ہے، وہ چاہتے یہ ہیں کہ زندگی اس طرح بسر کریں جیسے نبی کریمؐ نے بسر کی تھی، تاکہ حساب و کتاب میں زیادہ دقّت نہ ہو۔ نہ دنیا سے غرض نہ دنیا کی چیزوں سے، سارے جدید انکشافات، تحقیقات

ایجادات اور اختراعات کی طرف سے منہ موڑ کر آخرت کی طرف متوجہ ہیں۔ مجھے ان سے بھی شکایت ہے۔ کیونکہ ان کو تو یہ معلوم ہے کہ انسان خلیفۃ الارض بنا کر بھیجا گیا ہے اور خلافت و نیابت کی ذمہ داریوں میں یہ ضرور داخل ہے کہ جتنی چیزیں ان کے دائرۂ خلافت میں داخل ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کریں، ان کا مادہ ان کا خاصہ دریافت کریں۔ یہ بھی معلوم کریں کہ کونسی چیز خالقِ اکبر نے کس غرض سے پیدا کی ہے۔ اس کی غرض پوری کرنے کا سامان کیا جائے، یہاں تو سب سے بڑی دانائی یہ ہے کہ توکّل اور تفویض میں کمال حاصل کیا جائے، یعنی دنیا کا کام تو بالائے طاق، اپنے کام کا بھی خدا ہی کو وکیل بنا دیا جائے اور اپنے سارے مہمات اس کے سپرد کر دیئے جائیں، تاکہ ان کو وہی انجام دیدے، بعضوں نے تو یہاں تک کیا کہ اپنی غذا بھی پکی پکائی آسمان سے منگوائی، میری یہ جرأت نہیں ہوسکتی کہ ان طریقوں پر نکتہ چینی کروں، کیونکہ یہ بات دور دور تک پہنچتی ہے اور بڑے بڑوں نے اس پر عمل کیا ہے۔ جن کے مقابلے میں میرا یہ کہنا بھی کہ ذرّہ اور آفتاب کا فرق ہے۔ گستاخی ہے، کیونکہ کائنات کا ایک ذرہ بھی بڑی حیثیت رکھتا ہے، میں یہ دیکھتا ہوں کہ خالق کائنات کی مشیت پوری نہیں ہو رہی ہے اور جن کو زیادہ حق تھا کہ خدا کی خدائی کے کرشمے دکھائیں وہ مستغنی ہو کر خلوت نشیں ہو گئے۔ جب توحید پرستوں نے اپنا کام چھوڑ دیا تو خالقِ کائنات نے تین خدا کے ماننے والوں اور تین سو ساٹھ ۳۶۰ خدا کے پوجنے والوں

اور ملحدوں کو اس امر کے لئے متعین کیا کہ اس کے اسرارِ سربستہ کو منظرِ عام پر لائیں اور بہت سی ایسی چیزوں سے انسان کو واقف کریں، جو اب تک پوشیدہ تھیں۔

پنسلین، اسٹرپٹو مائسین، کلورومائسٹین اور خدا جانے کتنی چیزیں خالقِ اکبر نے بنا رکھی تھیں اور انسان امراض سے ہلاک ہو رہے تھے۔ بالآخر اللہ پاک نے بمصداق عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ انسانوں کے دماغ میں ان کا علم عطا فرمایا اور بمصداق اَوْحَیْنَا اِلَی النَّحْلِ انسانوں کو الہام یا وحی فرما کر یہ بتا دیا کہ پہاڑوں اور چٹانوں کے اندر ریڈیم، پلیٹینم، یورینیم وغیرہ چھپا رکھا ہے، اس کو نکال کر کام میں لاؤ۔

جتنی نئی نئی چیزیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں ساری کی ساری خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اگرچہ ان کو خدا کو نہ ماننے والے بھی نکال رہے ہیں اور کام میں لا رہے ہیں، ساری کی ساری خدا کی بنائی ہوئی ہیں۔ مجھے تو یہ صدمہ ہے کہ یہ سب چیزیں ہماری تھیں اور ہماری ہیں۔ کیونکہ ہمارے خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔

گفتگو کا اصول ہے تکلموا الناس علیٰ قدر عقولھم مخاطب (یعنی سننے والے) کی عقل کے مطابق کلام کیا کرو، یہ فصحائے عرب کا اصول ہے کہ جو باتیں سامعین کو نہ معلوم ہوں، ان کا بیان کرنا نادانی ہے اور وہ بھی غیر متعلق باتیں۔ عقیدہ کے لئے ضرورتِ عامہ کے لئے اعمال درست کرنے کی غرض سے

جن باتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔ ان کا بیان کرنا لازم ہے۔ خدا کا تخیل کسی انسان کے دماغ میں اب تک نہیں آسکا ہے۔ لیکن چونکہ اس کے وجود کے جاننے کے بغیر نیکی و بدی کا احساس مشکل ہے اور نیکی و بدی کے جاننے کے بعد انعام اور سزا جاننا بھی ضروری ہے، اس لئے جنت و دوزخ کا حال بتا دینا بھی ضروری تھا۔ سزا اور جزا جاننے سے پہلے اعمال کا حساب و کتاب سمجھنا بھی لازمی ہے، اس لئے قیامت کا ذکر لابدی تھا۔

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو واضح کر دیا اور سمجھا دیا، مگر پچھتر فی صدی بدوی عربوں کے دماغ میں نہ آسکا۔ اس دنیا کی باتیں جو مکہ یا مدینہ کے عربوں کے دماغ میں نہیں آسکتی تھیں، اس لئے سکوت فرمایا کہ اس نظامِ شمسی کو بھی صحیح طور پر نہیں جانتے تھے، لیکن یہ معلوم تھا کہ سات سیارے ضرور ہیں۔ اس لئے جب اللہ پاک نے فرمایا کہ میں نے سات آسمان بنائے۔ اور زمین بھی اتنی ہی رہی، اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمینیں بھی سات ہیں اور ان میں آبادیاں بھی ہیں، تمہارے آدم کی طرح آدم، ابراہیم کی طرح ابراہیم، عیسیٰ کی طرح عیسیٰ اور تمہارے نبی کی طرح نبی، اور ایک روایت میں تمہارے محمدؐ کی طرح محمدؐ ہیں۔ اس حدیث کے متعلق مولانا عبدالحی صاحب کے سامنے استفتاء پیش ہوا۔ آپ نے بڑے شرح و بسط سے اس کا جواب

تحریر فرمایا ہے۔ اس میں مذکورہ صدر آیتہ کی تفسیر میں مختلف مفسرین کے حوالہ سے تحریر فرمائی ہے۔ علاوہ اس کے بتایا ہے کہ حضرت ابن عباس کی حدیث بالکل صحیح ہے اس طویل بحث کو یہاں پیش کرنا لاحاصل ہے، چونکہ یہ مسئلہ علماء اور محدثین کے نزدیک مسلّم ہے۔

یہ ضرور ہے کہ لوگوں نے صحیح طور پر نہ سمجھا کہ سیاروں میں دنیا کیونکر ہوسکتی ہے اور دنیا میں انسان اور انسانوں میں نبی اور نبیوں میں بھی ہمارے نبی جیسا نبی، جو سید المرسلین ہیں اور تمام نبیوں سے افضل ہیں ان کے ہمسر چھ چھ نبی اور ہیں، تعجب کی بات ضرور تھی۔ مختلف زمانوں میں اس حدیث کے متعلق مختلف رائیں رہیں اور یہ ہے کہ جس بات کا علم نہ ہو اور جس کے متعلق واقفیت حاصل کرنا محال ہو۔ اس کو کوئی کیونکر مان لے۔ مگر یہ بات کہی ہوئی تھی، محمدؐ کی (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی نہ مانے تو کیسے، صادق وامین کی بات پر شبہ کیا جائے تو کیوں کر؟ تحیر ضرور رہا۔

تقریباً چار سو برس کے بعد ایک بزرگ محی الدین ابن عربی پیدا ہوئے، زندگی دینی ماحول میں نہایت متقیانہ گزاری، علوم دینی سے پوری واقفیت حاصل کی، عراق سے مکہ جاکر مقیم ہوئے، وہاں بہت کچھ علوم ظاہری اور علوم باطنی حاصل ہوئے۔ ان کو ایک کتاب کی شکل میں تحریر فرمایا ہے۔ نام اس کا فتوحات المکیہ ہے۔ تقریباً چھ سو صفحات بڑی تقطیع میں ہیں۔ میں نے

اس کو اپنے کالج میں منگوایا تھا، بہت تو نہیں کچھ معلومات حاصل کیں۔ کیونکہ ہر شخص کا ظرف محدود ہے۔ بڑی حیرت ہوئی جب میں نے اس میں پڑھا کہ (جو حضرت محی الدین ابن عربی نے لکھا تھا کہ) "میں ایک شب خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور ایک دوسرا شخص بھی طواف کر رہا تھا، مگر نماز نفل طواف نہیں ادا کر رہا تھا۔ قاعدہ ہے کہ سات بار کعبہ شریف کے گرد گھوم لینے کے بعد دو رکعت نماز نفل مقام ابراہیم پر پڑھ لینا چاہیئے، مگر وہ صرف طواف ہی کرتا تھا، نماز نہیں پڑھتا تھا۔ میں نے سمجھا کہ یہ کوئی بدوی (دیہاتی) ہے۔ قاعدہ نہیں جانتا ہے، میں نے اس شخص کو روک کر کہا کہ بھئی آپ نفل نہیں پڑھتے۔ حالانکہ سات طواف کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھنا چاہیئے، وہ شخص مسکرایا اور کہنے لگا کہ نماز عبادت ہے میں عبادت سے بری ہو چکا ہوں، مجھے حیرت ہوئی کہ ہوش گوش والا تندرست انسان عبادت سے بری کیوں کر ہوا۔ پوچھا کہ آپ عبادت سے بری کیوں کر ہوئے۔ کہا میری دنیا کی قیامت ہو چکی ہے۔ حساب و کتاب ہو چکا۔ اب جنت میں ہوں تمہارے اس کعبہ کی عظمت اور بزرگی سن کر اس کی زیارت کو آ گیا اور محبت سے اس کے گرد گھوم رہا ہوں۔

"مجھ کو فوراً عبداللہ بن عباس کی حدیث یاد آ گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا تھا کہ سات زمین ہے جس میں انسان بسے ہوئے ہیں اور

انبیاء بھی تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ سے ایک اور انکشاف ہوا کہ ان سیّاروں کے علاوہ اور دنیائیں ہیں، جن کی قیامت بھی ہوئی جا رہی ہے، کیونکہ اس نظامِ شمسی کے سیارے سب موجود ہیں، ان کی قیامت تو نہیں ہوئی ہے۔"

قرآن پاک میں جہاں رب العالمین کا فقرہ ہے۔ یعنی خدا تمام عالموں کا پالنے والا ہے۔ مفسرین رحمۃ اللہ علیہم نے چند عالم ثابت کرنے میں بڑی کاوشیں کی ہیں، رَبُّ الْمَشَارِقِ وَالْمَغَارِبِ سمجھانے میں بہت تاویلیں کی ہیں۔ حیرت تھی کہ بہت سے عالم اور بہت سے مشرق اور مغرب کس طرح بتایا جائے لوگ کہتے ہیں کہ سائنس سے گمراہی پیدا ہوتی ہے اور میرا تو ہر ہر انکشاف کے علم کے بعد ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

عرب کے بدویوں کو خدا کے نور کی تشبیہ قرآن پاک میں یہ دی گئی ہے، کہ یوں سمجھو کہ شیشہ ہے اس میں چراغ ہے، جو جل رہا ہے۔ مگر اس کا تیل نہ پورب کا ہے، نہ پچھم کا ہے، آج کی دنیا میں یہ کہہ دینا کافی ہے۔ کہ ایک مرکری بلب ہے، جس کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی ہے، مگر لامعلوم شخصیت کی لامعلوم چیز سے تشبیہ دنیا دانائی کے خلاف تھا، اگرچہ خدا کے علم میں آج کا مرکری بلب بھی موجود تھا۔ لیکن چراغ سے مثال دے کر سمجھایا ہے۔ اس میں بھی تیل کے ہونے کا تصور ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا ضروری

تھا کہ نہ اس میں تیل پچھم کا ہے، نہ پورب کا ہے، اس پر بھی سننے والے کو حیرت ہوئی کہ چراغ بے تیل کا کیونکر جل سکتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتانا تھا کہ اچھائی کیا ہے، برائی کیا ہے، جزا اور سزا کیا ہے، حساب و کتاب کیا ہے، کائنات کا پیدا کرنے والا کون ہے، اور اعمال کی جانچ کرنے والا کون ہے۔ اس لئے جو باتیں ان کے متعلق اور جو چیزیں ان کے لئے ضروری تھیں، بیان فرما دیا اور چیزیں لوگوں کی اپنی تحقیق و تفتیش پر چھوڑ دیں۔ انبیاء صرف دین کی تعلیم کے لئے تشریف لائے تھے، تمام علوم و فنون سکھانے کے لئے نہیں۔

ابھی کیا ہوا ہے! ابھی کتنی چیزیں اور ظاہر ہوں گی، جن کا علم آج کے بڑے سے بڑے سائنٹسٹ کو نہیں ہے۔ بلکہ وہ ان کے نزدیک محال ہے۔ جس نے وائر ٹیلیفون ایجاد کیا تھا، اس کے نزدیک وائرلیس سسٹم ناممکن العمل تھا، ریلوے انجن ایجاد کرنے والے کے نزدیک ہوائی جہاز کا ہونا بعید از عقل تھا۔ اسی طرح آج کے سائنس دانوں کے بعد جب سائنس کی ترقی اور بڑھ جائے گی اور آئندہ کے سائنسدانوں کے نزدیک آج کے سائنس دانوں کے جولانی محدود معلوم ہوگی۔ اس لئے دینی معلمین کے نزدیک یہ غیر ضروری تھا کہ وہ فلسفوں اور سائنس کی بحثوں میں پڑیں۔

فلکیات کے ماہرین کے انکشافات سے بہت سے معمے حل ہو رہے ہیں اور

سائنس کی ایجادات، انکشافات سے اللہ کی قدرت اور اس کی تخلیق کی وسعت اور اہمیت معلوم ہوتی جاتی ہے۔ یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہماری ضرورت ہماری عاقبت، ہمارے عیش کے لئے ہمارے خالق نے کتنی چیزیں بنا رکھی تھیں اور ان کا علم اور استعمال انسانوں کو عطا فرما کر ہم کو مستفیض فرما رہا ہے۔ خدائے تعالیٰ ہم انسانوں کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کے احسانات کا شکریہ ادا کرتے رہیں۔

دنیا میں آئے دن نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں اور ایک جماعت ہے کہ ان انکشافات میں منہمک ہے کچھ لوگ ستاروں کی دنیا کی حقیقت دریافت کرنے میں سرگرم عمل ہیں اور کروڑوں روپے اور اپنا قیمتی وقت صرف کر رہے ہیں۔ کوئی ایک چاند بنا کر زمین کے گرد گھمانا چاہتا ہے اور ایک حد تک اپنی کامیابی کو نمایاں کرتا ہے اور ہم صرف پھول جھڑی اور آسمان تارہ کی واقفیت کو غنیمت سمجھے بیٹھے ہیں۔ اور ایک جماعت چاند تک وفد بھیجے کا سامان کر رہی ہے، اس میں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ جانیں خطرے میں پڑتی ہیں، وہ لوگ اپنی جانوں پر کھیل کر یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں وجود میں آئی ہیں۔ ہم اس سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں ——— ایک عرصہ سے سمجھا جا رہا تھا کہ ہمالیہ کی انتہائی بلندی پر پہنچنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔ لیکن نیپال کے بسنے کم تعلیم یافتہ باشندے "تنزنگ" اور ایک یورپین

"ہلری" نے اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال کر ہمالیہ کی بلندی پر جا کر اپنا جھنڈا گاڑ دیا، مسلمان جنہوں نے اپنے دورِ عروج میں حیرتناک کارنامے دکھائے۔ پہاڑ پر جہاز پہنچایا اور بحرِ ظلمات پر پل باندھا تھا۔ وہ آج کل خوابِ غفلت میں پڑ کر بڑھتی ہوئی قوموں سے بہت پیچھے پڑ گئے۔ حالانکہ خالقِ اکبر نے عقل و ذکاء کی نعمتوں سے محروم نہیں رکھا ہے۔

تدبیرِ منزل

صرف انسان ہی کو نہیں، بلکہ تمام حیوانات کو ایک منزل قیام گاہ مکان 'گھونسلا'، یا 'ماں' کی ضرورت ہے۔ لیکن دو وجہ سے انسان زیادہ اس کا محتاج ہے۔ ایک تو اس لئے کہ اس کی صحت پر ہوا، پانی یا دھوپ کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس کو اعتدال کی زیادہ ضرورت ہے۔ قریب قریب جتنے جانور ہیں، ان کو یا تو پَر ہوا کرتے ہیں، یا جسم پر روئیں اور بال زیادہ ہوتے ہیں۔ جو ان کے جسم کو ہوا پانی اور دھوپ سے بچاتے ہیں۔ لیکن انسان کے جسم پر نہ تو بال ہے، نہ پَر۔ اس لئے اس کو اپنے آپ کو دیواروں اور سائبانوں کے ذریعہ سے محفوظ رکھنا پڑتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسان کے لئے شرم وحیا لازم ہے۔ اس لئے بھی اکثر حوائج ضروریہ کے لئے پردہ اور آڑ درکار ہے۔ ہندوستان میں جنگل اور درخت جن علاقوں میں ہیں، وہاں سایہ کے لئے بھی چنداں سائبان کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چھپ کر حوائج ضروریہ پورا کرنے کو بھی پردہ اور آڑ مل جاتا ہے۔ لیکن تیسری ضرورت یعنی حفاظت غذا اور اسباب راحت کے لئے ایک گھرے ہوئے مکان کی اشد ضرورت ہے۔ خواہ بانس اور رکھر وغیرہ سے

ان کو بنایا جائے یا مٹّی، اینٹ یا پتھّر سے، یہ صلاحیت پر موقوف ہے اور علاوہ اس کے سامان کے مہیّا ہونے کی سہولت اور دشواری پر بھی۔

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ مکان کا مستحکم اور محفوظ ہونا لازمی ہے۔ جتنا زیادہ مستحکم اور مضبوط ہوگا اُتنا ہی زیادہ لائق پسند ہوگا۔ مکان یا گھر ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسا ہو نا کہ جس میں روشنی اور دھوپ حسب ضرورت پہنچ سکے۔ کیونکہ ان ہی چیزوں پر انسانی حیات کا دارومدار ہے۔ لیکن ایسا ہو کہ خطرات سے محفوظ ہو اور منزل ایسے ہی مقام پر بنا نا مناسب ہوگا۔ جہاں غذا پانی اور ایندھن وغیرہ کے ملنے میں سہولت ہو اور جہاں چوری ڈکیتی کم ہوتی ہو اور درندوں کی آمد بھی کم ہو۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر انسان جنگلوں اور پہاڑوں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ وہاں درندوں کا خطرہ ہوتا ہے۔ مگر جہاں سامانِ زندگی اور سامانِ زندگی میں خصوصیت کے ساتھ غذا کے حاصل ہونے میں آسانی ہو۔ جنگلوں پر منزل اختیار کرنے کا پہلا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہاں آبادی کم ہوتی ہے۔ زمین وافر مل سکتی ہے۔ اگرچہ دورِ حاضر میں تو جنگل پہاڑ سب آباد ہوتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ بعض جنگل کے پیداوار سے ضروریات کے حصول میں آسانی ہوتی ہے۔ جن میں کتھ، ہرے، مہوہ وغیرہ کی تجارت میں سہولت ہوتی ہے۔ لیکن اب تو بیش قیمتی چیزیں جن کی دنیا کے بازار میں زیادہ ضرورت ہے، وہ جنگلوں اور

پہاڑوں ہی میں ملتی ہیں، یعنی معدنیات۔ اس لئے بھی اب جنگلوں اور پہاڑوں میں آبادیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔

میں ایک دفعہ چھوٹا ناگپور کے گھنا گھور جنگل سے گذر رہا تھا کہ یکایک ریلوے ٹرین ایسے مقام پر پہنچی۔ جہاں دور سے بجلی بتّی کی جگمگاہٹ نظر آنے لگی اور معلوم ہوا کہ ایک آگ کا پہاڑ ہے، جس سے شعلے اٹھ رہے ہیں۔ کہا گیا یہی ٹاٹا نگر (یعنی جمشید پور ہے) اور جب رات کو گرم گرم دہکتے ہوئے لوہے کے مَیل پھینکے جاتے ہیں۔ وہاں پر ایک طرح کا آگ کا پہاڑ معلوم ہوتا ہے، غرض یہ کہ جنگل میں منگل ہو رہا ہے۔

الغرض منزل اختیار کرنے کے قبل مقام کا انتخاب بہت اہم ہے۔ میں نے ضرورت منزل میں ابھی صرف حفاظت کا ایک پہلو بیان کیا ہے۔ لیکن حفاظت جسم کے علاوہ غذائی سامان کی حفاظت زیادہ ضروری ہے۔ حیوانات اپنی غذا میں کسی تدبیر اور حکمت کے محتاج نہیں ہیں۔ جو شئے جس شکل میں مل جاتی ہے۔ اس کو اسی طرح کھا کر اپنی بقائے حیات کا سامان کر لیتے ہیں۔ لیکن انسان اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے اپنی غذائی شئے کی صفائی اور نفاست کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس کو طبخ دے کر سریع الہضم بناتا ہے، جیسے گیہوں کو پہلے کنکر، کرکٹ سے صاف کر کے پھٹک اور رگڑ کے پیستا ہے۔ پیسنے کے بعد آٹے کو چھان لیتا ہے۔ چھان کے گوندھتا ہے

گوندھ کر روٹی بنا کر پکاتا ہے۔ اسی طوالت کے لئے ایک تو مختلف قسم کے برتنوں اور آلات کی ضرورت ہے، جیسے سُوپ، چکّی، چلنی، لگن، چولہا اور توا وغیرہ۔ اس لئے چاہیئے کہ کوئی منزل ایسی ہو جس میں ان چیزوں کو حفاظت سے رکھا جا سکے۔ علاوہ ازیں جب غذا میں اتنے تکلّفات رائج ہیں، تو اگر انسان اپنی غذائی چیزیں بھوک سے پہلے مہیّا کر کے رکھ نہ لیں، تو وقت پر بڑی دقت پیدا ہو جائے گی۔ اس کے لئے غذا کا ذخیرہ کرنا بھی عقلاً ضروری ہے۔ اگرچہ اب شہری رہائش میں ہر چیز وقت پر حسب خواہ مِل جاتی ہے۔ مثلاً آٹا بھی ملتا ہے اور پکی پکائی روٹیاں بھی مِل جاتی ہیں، پھر بھی ایک صاحبِ منزل کو لازم ہے کہ غذا کا سامان قبل سے مہیا رکھے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سفر سے آدمی ایسے وقت لَوٹ کر گھر آتا ہے، جس وقت دکانیں بھی بند ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ گھر میں سامان مہیا رکھا جائے۔

اس سامان اور اتنے غذائی اہتمام کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی معاون ہو، کیونکہ ایک انسان اپنے کسب معاش میں مشغول ہو جاتا ہے، تو محنت و عمل کی وجہ سے تھک کر استراحت چاہتا ہے۔ لیکن استراحت کے وقت غذا کے سامان اور نظام میں مشغول ہو جانا اکثر شاق ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں فطرت متقاضی ہے کہ تقسیم عمل ہو۔ اس لئے قدرت نے انسان کی ۲ دو قسمیں

زن و مرد پیدا کیں اور دونوں کی فطرت جداگانہ ہے۔ قانون فطرت کے رُو سے عورت اور مرد کا اتصال ضروری ہے۔ اس اتصال کے ساتھ ایک خانہ داری قائم ہوتی ہے اور سلسلۂ تناسل بھی جاری ہوتا ہے۔

عورتیں فطرتاً مردوں سے زیادہ باحیا ہوتی ہیں۔ اس لئے ایک مکان کی ضرورت پڑتی ہے۔

عورتوں کی عافیت و آرام کا سامان ہونا ضروری ہے۔ یعنی ایک انگنائی کا ہونا ضروری ہے۔ جس میں آرام سے بے تکلّفانہ غیر محرموں سے جُدا بیٹھ کر ہوا اور دھوپ کے فوائد حاصل کر سکیں اور اسلامی پردے کا اقتضاء یہی ہے۔ کیونکہ اپنی ضرورتوں سے بُرقعہ اوڑھ کر بازاروں، کشت زاروں اور باغات میں جائیں۔ کیونکہ بُرقعہ اوڑھ کر جانا اور اپنی ضروری کام انجام دینا شرعاً جائز ہے۔ لیکن بُرقعہ اوتار کر آزادانہ نشست کے لئے ایک گھر اور اس میں ہوادار صحن ضروری ہے۔ جس میں کوئی غیر محرم بغیر اجازت داخل نہ ہو سکے۔

تدبیر منزل میں اہم ترین مسئلہ اہل منزل کے آرام و استراحت اور رفع حوائج و ضروریات، خوش طبعی اور بشاشت مزاج کا ہے۔ ہر منزل میں جب ایک عورت کا ہونا لازم ہوتا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ اولاد کا وجود میں آنا فطری ہے اور جب چند افراد ایک گھر میں جمع ہو جاتے ہیں

توپھر کسی معاون اور مددگار کی ضرورت پڑ جاتی ہے اور ایسے معاون نوکر یا خدمت گار ہوتے ہیں۔ اولاً ایسے معاون کی تلاش کرنی پڑتی ہے جس کو فطرتاً تمام امور میں مشارکت ہو، جیسے بیوی جس کو رہنے سہنے کھانے پینے، سونے جاگنے سب میں فطری مشارکت ہوتی ہے جس کا انفصال ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ جب اولاد ہوتی ہے، تو اولاد کے راحت و آرام، تربیت اور تعلیم ہر چیز میں ماں باپ دونوں کی دلچسپی، ہمدردی کوشش اور محنت مشترک ہوتی ہے۔ دونوں کا اولاد کی محبّت میں اشتراک ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب کسی اور معاون کی ضرورت پڑتی ہے، تو اس کو خانہ داری میں فطری دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کو اسی حد تک خانہ داری سے لگاؤ ہوتا ہے۔ جہاں تک اس کی اپنی ضرورتوں کے پورا ہونے کا تعلق ہے۔ بعض محض کھانا اور کپڑے پر کام کرتے ہیں۔ بعض علاوہ اس کے تنخواہیں مقرر کرتے ہیں اور وہ تنخواہیں ایسی ہوتی ہیں، جس سے ان کی اپنی خانہ داری میں سہولت ہو۔ کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے کہ نوکر یا دائی کی شادی کر دینی پڑتی ہے۔ علاوہ اس کے جب ان سے اولاد پیدا ہوتی ہے تو ان کی پرورش اور پرداخت کا سامان کرنا ہوتا ہے۔ الغرض جس کی معاونت کی ہمیں محتاجی ہے۔ اس کی ضرورت اس کی خواہش اور اس کی خوشنودی کا خیال رکھنا لازمی ہے۔ اب ایک خانہ داری کی مثال

انسان کے جسم کی سی ہو جاتی ہے۔ جن میں مختلف اعضاء ہوتے ہیں۔ لیکن سب کو متفق ہو کر کام کرنا پڑتا ہے اور استراحت کے وقت ہر عضو کو راحت پہنچانا لازم ہوتا ہے اور جب کبھی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے، تو تمام اعضا بیچین ہو جاتے ہیں یہ نہیں ممکن کہ پاؤں کی انگلی زخمی ہو جائے تو دماغ کو سکون حاصل ہو۔ اسی طرح ہر گھر کے تمام افراد کی راحت اور ان کا آرام صاحب خانہ کی راحت و سکون کے لئے لازمی ہے۔ اگر ایک خادم کراہتا رہے، تو صاحب خانہ کو نیند نہیں آسکتی اور اگر خدانخواستہ مزاج میں ایسی بے اعتنائی اور بے پروائی آجائے کہ دائی یا نوکر کی تکلیف کا احساس نہ ہو اور ان کی تکلیف سے دل بیچین نہ ہو جائے، تو یہ توقع رکھنا کہ غلام مالک کی تکلیف و مصیبت کے وقت اس کا شریک حال ہوگا، غلط ہے۔ اس لئے ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک گھر میں ڈاکو آگئے اور صاحب خانہ کو ہلاک کر دیا، لیکن ملازمین یا تو سوئے کے سوئے رہے، یا بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہماری غرض یہ ہے کہ انسانی فطرت ہے کہ جو جس کی ہمدردی کرتا ہے، وہ اس کا ہمدرد ہو جاتا ہے اور بے پروائی کرنے والوں سے دوسرے بھی بے پروائی کرتے ہیں۔ دنیا بدلے کی جگہ ہے۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ ہم دوسروں سے فائدہ اٹھائیں اور دوسروں کی مدد حاصل کریں، تو ہمیں بھی دوسروں کو فائدہ پہنچانا اور دوسروں کی مدد کرنا لازم ہے۔

زن وشو کے تعلقات اگرچہ بہت گہرے تعلقات ہیں اور تمام معاملات میں دونوں کی مشارکت ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک بیوی اپنے شوہر کی بدترین دشمن ہو جاتی ہے۔ ایک سبب تو عورت کی طبیعت کی خصاصت اور رذائت ہوتا ہے۔ دوسرا سبب مرد کی بدسلوکی، یا بداخلاقی ہوتی ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اس وقت ہندوستان میں نوّے فیصدی گھر ایسے ہیں، جہاں زن وشو میں اتفاق نہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مرد عموماً عورتوں کے احساسات، ان کی ضروریات، ان کے مطالبات اور ان کے حقوق سے بے توجہی برتتے ہیں۔ اس ضمن میں مجھے ایک شرعی غلط فہمی دور کرنی ہے، وہ یہ کہ قرآن کریم میں ایک آیت ہے "اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَے النِّسَآءِ" جس کا ترجمہ یہ سمجھتے ہیں کہ مرد عورتوں کے حاکم ہیں اور اس وجہ سے ان سے تحکّمانہ برتاؤ کرتے ہیں، جس سے عورتیں بیزار رہتی ہیں۔ حالانکہ "قوام" کے معنی محافظ اور مددگار ہے۔ منشاء یہ ہے کہ مرد عورتوں کے بڑے محافظ اور مددگار رہیں۔ یعنی اس آیت کی رُو سے مَردوں پر فرض ہے، کہ عورتوں کی حفاظت کریں اور ہمیشہ ان کے مددگار رہیں۔
ظاہر ہے کہ جب کوئی کسی کا مددگار ہو جاتا ہے، تو وہ احسان مند اور گرویدہ ہو جاتا ہے۔ یہی حکمت تھی اس آیت کے نازل فرمانے میں کہ عورتیں ہمیشہ اپنے شوہر پر گرویدہ رہیں۔ کیونکہ اسی قرآن میں "اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ"

بھی فرمایا گیا ہے۔ یعنی عورتوں کے دھوکے بڑے ہیں۔ ان دھوکوں سے محفوظ رہنے کا سب سے بڑا آلہ یہ ہے کہ ان کو ہمیشہ اپنا گرویدہ بنائے رکھا جائے۔

غور کرنا چاہیئے کہ ایک عورت اپنے گھر بار عزیز واقارب سے دائمی جدائی اختیار کر کے۔ اپنے میکہ کے عیش وآرام کو ترک کر کے، ایک مرد کی محبت اور رفاقت کا عہد باندھتی ہے اور صبح سے شام تک اسکی عافیت اور اس کی استراحت کا سامان کرتی رہتی ہے اور اس کی اولاد کی خدمت، پرورش اور پرداخت میں لگی رہتی ہے۔ اگر شوہر اُس سے خوش اخلاقی نہ برتے، تو اس کو کس قدر شاق ہو گا۔ اگر شوہر کی محبت اور شفقت میں شبہ پیدا ہو جائے، تو اس گھر کی دیواریں اُسے قیدخانہ معلوم ہونے لگیں گی اور اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگیں گے۔ شریف عورتیں تو ہر حال میں صبر کر کے اپنے دل کو دبائے رہتی ہیں اور جی ہی جی میں گھٹتی جاتی ہیں اور بدمزاج عورتیں، تو ہنگامہ برپا کر دیتی ہیں۔ جس سے صاحب خانہ کی جان وبال میں پڑ جاتی ہے۔

صاحب خانہ چاہے، تو اپنے گھر کو دوزخ بنائے، چاہے تو اس کو جنّت بنائے، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ صاحبِ خانہ باہر سے تشریف لائے تو ہر شخص "چپ چپ، ہاں ہاں دیکھو صاحب آگئے، صاحب آگئے" کہنے

لگتا ہے اور سارے گھر میں سنّاٹا چھا جاتا ہے اور جب گھر سے باہر نکلے تو کوئی ہنستا ہے، تو کوئی کودتا ہے، کوئی روتا ہے، کوئی گاتا ہے۔ مجھے تو بڑی مسرت ہوتی ہے، جب میں مکان پر پہنچتا ہوں۔ "ابّا آئے، ابّا آئے" کا نہایت مسرت افروز کورس ہونے لگتا ہے۔ کوئی کہتا ہے چھوٹے ابّا آئے، چھوٹے ابّا آئے۔ کوئی دوڑا کہ نانا ابّا آئے، نانا ابّا آئے۔ دادا ابّا آئے، دادا ابّا آئے۔ یہ تو بولنے والے اور دوڑنے والے بچّوں کا حال ہے کہ سارے کا سارا گھر گونج اٹھتا ہے۔ اور جب تک اطمینان سے بیٹھ نہ جاؤں، آواز نہیں دبتی۔ چھوٹے بچّے اپنی ماؤں کی گود میں اُچھلنے لگتے ہیں۔ عورتیں اپنے کمروں سے نکل آتی ہیں۔ مرد ساتھ آنگن میں داخل ہوتے ہیں۔ گویا عید مچ جاتی ہے۔ نوکر الگ بے بلائے دوڑے آتے ہیں۔

یہ بہت بُرا ہوتا ہے کہ صاحب خانہ گھر میں داخل ہوتے ہیں، کسی کو ڈانٹ، کسی کو ڈپٹ، یہ چیز یہاں کیوں پڑی ہے۔ یہ کرسی یہاں کیوں آئی، لڑکے گرد میں کیوں کھیل رہے ہیں۔ عورتیں بیٹھی باتیں کیوں کر رہی ہیں غصّہ میں سب پر ایک آفت آگئی، ہر شخص گھبرا اٹھا کہ خدا جانے ہماری کیا گرفت ہوتی ہے اور کون سا الزام عائد ہو جاتا ہے اور ہزاروں صلواتیں جاری ہو جائیں گی، بچّے الگ ڈر سے سٹک گئے، نوکر چھپ گئے، عورتیں

کمروں میں چلی گئیں اور یہاں حضرت خفا ہو ہو کر سب کو پکارتے رہے۔ کہاں ہیں لوگ، کدھر گئے، کیا سب کو سانپ سونگھ گیا، ابھی ہنگامہ سُن رہا تھا، اب کوئی نظر نہیں آتا، میرے پاس کوئی نہیں آتا۔ آئے تو کیا آئے، نوکر آتا ہے تو اُلٹا پیر آتا ہے کہ کوئی جھڑپ نہ پڑ جائے، طمانچہ نہ بج جائے۔ بیوی گھبرائی آتی ہے کہ خدا جانے کیا کیا الزامات نکلیں۔ اور کس کس بات پر خفگی ہونے لگے اور میکے والوں پر گالیاں شروع ہو جائیں، ایک طرف تو یہ ہے کہ: ؎

زنِ بد در سرائے مردِ نکو
ہم دریں عالم است دوزخِ او

اور دوسری طرف: ؎

ہر کہ او بد زبان شد و بد خو
ہم دریں عالم است دوزخِ او

صاحب خانہ کو، ہر فرد کی دلجوئی، ہر ایک کی مزاج دانی، ان کی ضرورت، ان کے احساسات سے واقفیت ہونی چاہیئے، ورنہ گھر آرام و راحت کا مرکز نہیں، بلکہ رنج و مصیبت کا گہوارہ ہو جائے گا اس لئے اس کو سب سے پہلے اکتساب معیشت کی طرف منہمک ہونا چاہیئے، اور اس کے بعد افراد منزل کی خوشنودی کی طرف متوجہ۔

اس لئے پہلے حصول مال کا طریقہ اور اس کے متعلق ضروری باتیں بیان کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بیوی کا انتخاب اُس کے حقوق اور فرائض، پھر اولاد کی پرورش اور تربیت اور ماں باپ کی خدمت، ان کے حقوق۔ آخر میں نوکر اور غلام کا انتخاب اور اس کے ساتھ سلوک کے طریقے بیان کئے جائیں گے۔

حصولِ مال

مال درحقیقت اُس چیز کو کہتے ہیں، جس سے ضرورت پوری ہو سکے۔ عام اس سے کہ سونا چاندی کی شکل میں ہو، یا پتھر اور مٹّی کی شکل میں۔ لیکن تمام ضروریات میں سے غذا کو زیادہ اہمیت ہے۔ اس لئے جس چیز سے غذا حاصل ہو سکے، یا جو خود غذا بن سکے وہ زیادہ اہم ہے۔ سونا یا سکّہ اس لئے خصوصیت کے ساتھ مال یا دولت سمجھا جاتا ہے کہ اس سے ساری ضروریاتِ زندگی بسہولت بدل لی جا سکتی ہے۔ یہ امر دشوار ہو گا، کہ ہر جگہ من دو من غلّہ ڈھویا جائے۔ لیکن یہ آسان ہے کہ اپنے پاس سو پچاس روپے رکھ لئے جائیں اور جہاں جائیں وہاں اس سے ضروریات کا تبادلہ کر لیا جائے۔ کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ سکّوں کا تبادلہ مشکل ہو جاتا ہے، یا اس کی قیمت میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ اس لئے سونا ایک ایسی چیز ہے کہ اس کی قیمت اتفاقی طور پر کم و بیش ہو جائے۔ لیکن یہ زائل نہیں ہو سکتا اس میں دو خوبیاں ہیں، ایک تو یہ کہ اس میں فطری نفاست ہے۔ دوسری

یہ کہ اس میں تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ بہت سے ایسے دھات ہیں، جن میں زنگ وغیرہ سے تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا تھوڑا دوسری چیزوں کے بہت سے مقابلہ کرتا ہے۔ ایک ماشہ سونا اس گرانی کے زمانہ میں بھی بیس[۲۰] سیر چاول کے برابر ہو سکتا ہے۔ اس لئے ذخیرہ کرنا ہو تو سونا ذخیرہ کرے۔ یا سکّہ رائج۔ غلّہ وغیرہ چونکہ خراب ہونے والی چیز ہے۔ اس لئے ان کو بقدر ضرورت محفوظ رکھنا چاہیئے کہ وقت پر دقّت نہ ہو۔

مال کا اندازہ تین طریقہ پر ہو سکتا ہے۔ آمدنی[۱] پر۔ بجٹ[۲] پر۔ یا خرچ[۳] پر۔ کسی شخص کی آمدنی دس ہزار ہے، لیکن خرچ بارہ ہزار، تو وہ مالدار نہیں کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ دو ہزار کے لئے وہ دوسروں کا ویسا ہی محتاج ہے، جیسا کہ ایک گدا، کہ اس کو پورے سال کے لئے دو ہزار کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن برخلاف اس کے ایک دوسرا شخص دس ہزار حاصل کرتا ہے اور وہ رقم اس کی ضرورت کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ وہ خوش حال کہا جا سکتا ہے۔ تیسرے شخص کو اتنی آمدنی ہے کہ سارے اخراجات کے بعد دو ہزار بچ رہتے ہیں۔ درحقیقت وہ صاحب مال ہے۔ شریعت میں اسی کو صاحبِ نصاب کہتے ہیں، جو دوسروں کی مدد کے لائق ہے۔ سارے ملکی توقعات اسی سے وابستہ ہیں، جو صاحبِ نصاب ہیں۔ انتظاماتِ ملکی ہیں، امداد، مستحقین میں۔ تعلقاتِ بین الاقوام کے قیام میں وہی مفید ہوتے ہیں۔

وہی زکوٰۃ دیتے ہیں اور صدقات، وہی عالمگیر بین الاقوامی اجتماع یعنی حج میں شرکت کر سکتے ہیں اور وہی مرکزی ایام عرفات کا خطبہ اور ان کی ہدایت تمام عالم میں پھیلا سکتے ہیں۔ اس لئے اسلام میں صاحب نصاب سے بہت کچھ امیدیں وابستہ ہیں۔ اسی لئے قنوتی یا قناعتی زندگی یعنی رہبانیت کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا ہے۔

حصولِ مال، یا کسب معاش ہر انسان پر لازم ہے۔ لیکن تین امور کی احتیاط ضروری ہے۔ اول یہ کہ ظلم و تعدی سے، یا دھوکا اور فریب سے مال نہ حاصل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ معیوب طریقہ پر مال نہ حاصل کیا جائے۔ یعنی ایسا پیشہ کر کے جس کو شائستہ لوگ ناپسند کریں۔ تیسرے یہ کہ اپنے آپ کو ذلیل اور حقیر کر کے پیسہ نہ کمایا جائے۔ پہلی صورت میں چوری، دھوکا بازی، چور بازاری وغیرہ داخل ہے۔ دوسری مسخری، دلگی، بھانڈ کا کھیل وغیرہ۔ تیسری قسم میں گداگری وغیرہ داخل ہے۔

کسب معیشت کے جائز طریقے تین ہیں۔ ایک شریف۔ دوسرا خسیس، تیسرا متوسط۔ کسب شریف کے بھی تین طریقے ہیں۔ اول وہ جس کا تعلق عقل سے ہو، جیسے وزارت اور تدبیر وغیرہ۔ دوسرا وہ جس کو علم و فضل سے تعلق ہو، جیسے درس و تدریس، کتابت و طب وغیرہ۔ تیسرا وہ جس کا تعلق قوت، محنت اور شجاعت سے ہو۔ جیسے سپہگری یا فوجی خدمت، تحفظ ملک وغیرہ

خسیس کسب محنت کی بھی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ جو مصلحت عامہ کے خلاف ہو۔ یعنی جس سے قوم و ملک کو فائدہ نہ پہنچے، بلکہ نقصان رساں ہو۔ جیسے چور بازاری، چوری ڈکیتی، سحر وغیرہ۔ دوسرا وہ کہ مصلحتِ انسانی کے خلاف ہو، جیسے مسخرگی، ناچ گانا، جوا بازی اور قسم قسم کے کھیل و تماشہ۔ تیسرا وہ کہ طبیعتِ انسانی کو ناپسند ہو لیکن ضرورتِ انسانی کے لئے مفید ہو۔ جیسے چمار یا حجام کا، یا مہتر اور ڈوم کا کام۔ اگرچہ یہ بُرا معلوم ہوتا ہے اور ایک شریف انسان یہ کام کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن ضرورت ہے کہ یہ کام انجام دیئے جائیں۔ اگر چمار کا کام بالکل بند ہو جائے، نہ دباغی ہو، نہ کفش دوزی، تو انسان مصیبت میں پڑ جائے۔ اس کام کو تو اب نفاست سے انجام دیا جا رہا ہے۔ بڑی بڑی ٹینریز اور شو کمپنیاں کھل گئی ہیں۔ اور حجامی کا کام یعنی فصد نشتر تو وہ اب نہایت معزز پیشہ سرجری کا ہے۔ بڑے شہروں میں اب ڈوم اور مہتر کا کام بھی بڑی خوبی کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ پانی کی نلکیوں کے ذریعہ سے غلاظت بھی دُھل کر بہہ جاتی ہے اور سڑکیں بھی صاف ہو جاتی ہیں۔ اب ہوز پایپ سے سڑک کو دھو دیا جاتا ہے۔ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں ابھی ان کی ضرورت ہے۔ لیکن سیپٹک کے رائج ہو جانے کے بعد، غلیظ کا معاملہ تو صاف ہو جائے گا۔ باقی رہا گھر، کرکٹ تو اس

کام کے لئے اب کالجوں میں گریجویٹ طلباء کو سوشل سروس کے ذریعہ سے اس کی معیوبی دور کی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ عنقریب یہ سارا کام ہر شخص کو خود کرنا ہوگا۔

دوسری قسم یعنی کھیل تماشہ بھی اب معیوب نہ رہا۔ جب یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور وائس چانسلر سینما ہاؤس قائم کرکے اس کے عیب کو مٹاتے ہیں۔ اور ڈرامہ، کریکچر، مطربی اور ڈانس، فنونِ لطیفہ میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس لئے اب سوائے چوری، ڈکیتی، یا جُوا کے معیوب اور مبتذل پیشہ باقی ہی نہیں رہا۔

متوسط پیشہ تجارت اور زراعت، صنعت و حرفت وغیرہ ہے لیکن دورِ حاضر میں تو یہی اعلیٰ پیشے ہیں۔ یعنی ایجاد و اختراع انکشاف اور تجدید تمام پیشہ پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اب ان پیشوں کا تعلق علم اور فضل سے ہو گیا ہے۔ تجارت اور زراعت میں بڑی بڑی ڈگریاں مل رہی ہیں، جو کسی طرح علوم و فنون سے کم نہیں۔ سائنس اور میکانک کا کیا کہنا ہے۔ موجودہ دنیا کو فخر ہے تو ان ہی فنوں پر۔ اس لئے جن پیشوں کو متقدمین نے متوسط قرار دیا تھا، وہ اب اعلیٰ اور اشرف ہیں اور جو اعلیٰ سمجھے جاتے تھے وہ اوسط اور ادنیٰ قسم کا پیشہ۔ تو پیشے کے اعتبار سے کوئی باقی نہیں رہا۔ سب کو ترقی ہو گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب انسان مساوات کا مستحق ہو گیا ہے اور

اب کوئی انسان دوسرے انسان سے ذلیل یا رذیل نہیں ۔

المختصر جو مال دوسروں کو نقصان پہنچا کر حاصل کیا جائے اور جس سے انسان نگاہوں میں ذلیل اور حقیر ہو جائے، وہ لائقِ رغبت نہیں ۔ اگرچہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو ۔ اور جو مال دوسروں کو منفعت پہنچا کر، دوسروں کی حاجت براری کر کے، یا کوئی خدمت انجام دے کر حاصل کیا جائے، وہ متبرک اور لائق احترام ہے ۔ اگرچہ مقدار میں کم ہو ۔ ایسا ہر زمانے اور ہر حال میں مسلّم ہے ۔ اپنی ضرورت پورا کرنے کو دوسروں کو نقصان یا ضرر نہ پہنچانا ہے ۔ یہی ہے انسانیت ۔

دولت کتنی ہی حاصل کی جائے، لیکن اس کو منافع کے کام میں نہ لگایا جائے، تو وہ قائم نہیں رہ سکتی ۔ اس لئے لازم ہے کہ جب دولت حاصل ہو، تو اس کا ایک حصّہ ایسے کام میں ضرور لگا دیا جائے، جس سے منفعت حاصل ہوتی رہے ۔ کیونکہ ذریعہ حصول معیشت ہمیشہ ایک طرح سے قائم نہیں رہتا ۔ عالم کو انقلاب ہے، تو ضرور ہے کہ تمام حالات کو انقلاب ہوتا رہے ۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان صحت و سن کی وجہ سے مجبور ہو جاتا ہے ۔ کبھی اور اور اسباب پیدا ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے لازم ہے کہ اپنی موجودہ آمدنی پر مطمئن ہو کر مستقبل سے غافل نہ رہے ۔

دولت یا مال حاصل کرنے سے زیادہ اس کے صحیح خرچ کے مواقع

ملحوظ رکھنا مشکل ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پیسہ موجود ہونے پر وہ خرچ لازم آ جاتا ہے، جو پیسہ نہ رہنے پر غیر ضروری سمجھا جاتا ہے ۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس خرچ کو جو پیسہ نہ رہنے پر غیر ضروری تھا پیسہ موجود رہنے پر بھی غیر ضروری سمجھا جائے ۔ کیونکہ اکثر کام ایسے ہیں کہ واقعی ضروری ہی نہیں، بلکہ فرض ہو جاتے ہیں ۔ جیسے اہل نصاب ہو جانے پر زکوٰۃ فرض ہے، قربانی واجب ہے، حج فرض ہے، جو پیسہ نہ رہنے پر مستحب بھی نہ تھے ۔ اسی طرح عرفاً بھی بہت سی چیزیں ضروری ہو جاتی ہیں ۔ جیسے غربت کی حالت میں اپنے بچّے کی پرورش لازم ہے ۔ کبھی اس کو بھی کسی دوسرے پر سونپ دیتے ہیں ۔ لیکن پیسہ ہو جانے پر اقارب اور ہمسایہ کے حقوق بھی عائد ہو جاتے ہیں ۔ اس لئے مال حاصل ہو جانے کے بعد، نہایت احتیاط سے اور غور و فکر کے ساتھ اپنے اخراجات کی نگرانی کرتا رہے ۔

مال کے خرچ کرنے میں تین چیزوں کا لحاظ رکھے ۔ اول یہ کہ گھر والوں کو تکلیف نہ ہو ۔ دوسرے یہ کہ عزت اور آبرو خراب نہ ہو، تیسرے یہ کہ بخل اور حرص کی ذلت میں مبتلا نہ ہو ۔ لیکن بہرحال تین باتوں کا خیال ضرور رکھے ایک تو یہ کہ خرچ آمد سے زیادہ نہ ہو ۔ دوسرے یہ کہ کسی ایسے مد میں صرف نہ کرے جس سے منافع نہ ہو، یا کوئی ایسی چیز خرید نہ کرے، یا نہ بنائے جس کے خریدار اور قدر دان کم ہوں ۔ اگر خرچ سے کوئی رقم بچ رہے، تو ایسے مصرف

میں لگائے، جس سے منفعت ہو۔ اور جب چاہے تو اس سے اپنی رقم نکال سکے تیسری بات یہ کہ اگر تجارت میں لگائے، تو ایسا بیوپار کرے کہ گو منافع کم کم ہاتھ آئے، لیکن جلد از جلد سرمائے کا اُلٹ پھیر ہوتا رہے۔

عقل کا منشا ر یہ ہے کہ ضروریاتِ زندگی بالخصوص غذا کا ذخیرہ ضرور رکھے۔ کیونکہ ایسے مواقع آجاتے ہیں کہ انسان کسب سے معذور ہو جاتا ہے، بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ یا قحط سالی ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے حصول غذا دشوار ہو جاتا ہے۔ دوسری ضروریات کو تو انسان روک بھی سکتا ہے۔ لیکن بغیر غذا کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے اور ایک صاحب خانہ کو صرف اپنی ہی حیات و بقا کی فکر نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے سارے گھر والوں کا سامان کرنا ہوتا ہے۔

تجربہ کار لوگوں نے بتایا ہے کہ اگر دولت حاصل ہو تو اس کو محض ایک شکل میں نہ رکھے، بلکہ مختلف صورت میں اس کو منتقل کر دے۔ کچھ نقد ہو، کچھ جنس، کچھ زیور وغیرہ کی شکل میں، کچھ غلّہ، کچھ کھیت، کچھ مویشی وغیرہ اپنے ملک اور ماحول کے لحاظ سے جو چیزیں وقت پر کام آسکتی ہوں۔ ان شکلوں میں منتقل کر دے۔ کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک قسم کی دولت پر ہلاکت آتی ہے، تو دوسرے کا قائم رہنا ممکن ہوتا ہے۔ بالفرض انقلاب نظام سلطنت سے سکّہ کی قیمت اور اس کا

رواج بدل گیا، تو سونے چاندی کی حالت برقرار رہی۔ کبھی مویشی کی بیماریاں پھیل جاتی ہیں، تو نقود سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، کھیت جل جائے زراعت خراب ہو جائے، تو مویشی سے کام چلاتے ہیں۔ ایک دور اندیش اور پیش بیں شخص کو لازم ہے کہ ان امور کا لحاظ رکھے۔

خرچ کرنے میں بھی چار چیزوں کا لحاظ رکھے۔ نہ تو ایسا کرے کہ بخل معلوم ہو اور اپنے وابستگان کو تنگی اور بے دلی پیدا ہونے لگے۔ عزیز و اقربا کے توقعات کے خلاف عمل ہو۔ یعنی جس کے ساتھ جو سلوک کرنا شرعاً اور عقلاً ضرور ہو، اس سے دریغ نہ کرے۔ اور نہ ایسا ہو کہ ہاتھ بالکل کھول ڈالے کہ ساری پونجی صرف ہو جائے اور اسراف کا ارتکاب ہو جائے خدا کے نزدیک بھی جوابدہ اور دنیا میں بھی موردِ لعن و طعن ہو جائے۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا ہے کہ لَا تَغْلُلْ یَدَکَ فِیْ عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْهَا کُلَّ الْبَسْطِ۔ یعنی نہ تو اپنا ہاتھ بند کر کے گردن میں سٹالو۔ کہ کچھ نہ خرچ کریں گے، اور نہ یہ کہ بالکل کھول دو جس کا نتیجہ یہ ہو کہ تَقْعُدُ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا۔ یعنی مایوس، شرمندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔

تیسری بات یہ ہے کہ دکھلاوے کی غرض سے کبھی خرچ نہ کرو، نہ فخر جتانے کو اور نہ اپنے نفس کو مغرور کرنے کو، نہ دوسروں پر تفاخر دکھانے کی غرض سے۔ خدا کو یہ امور ناپسند ہیں اور عرف عام میں بھی معیوب ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ بدانتظامی سے خرچ کرنا بھی بہت برا ہے۔ جو کچھ خرچ کیا جائے قاعدہ اور انتظام سے۔ انتظام کے معنی یہ ہیں کہ وقت پر ضرورت کے مطابق خوش سلیقگی کے ساتھ۔ مثال کے طور پر یوں سمجھے کہ آپکے ایک بہت بڑے مخلص دوست آئے، صبح ہوئی، مونگ پھلی بیچنے والا آیا۔ آپنے دو آنے کی مونگ پھلی خریدی اور خود کھائی، اُن کو کھلا دی۔ پھر جلابی والا آیا۔ کہا! ہاں بھائی کچھ جلابی کھائی جائے۔ جلابی کھلائی۔ پھر گھر سے چپاتیاں آئیں اور آلو کی بھاجی، وہ رکھوایا۔ پھر کہا اے لونڈے ایک سیخ کباب بھی لے آ، وہ بھی تھوڑا تھوڑا کھالیا۔ پھر چائے آئی۔ آپنے فرمایا ہاں دو انڈے بھی اُبال لا۔

یہی اگر یوں ہوتا کہ آپ پہلے سوچتے کہ دوست کا ناشتہ کیا ہونا چاہیئے۔ ایک ٹیبل پر مونگ پھلی بھی ایک طشتری میں ہوتی۔ ایک رکابی میں جلابی، چند چپاتیاں اور آلو کی بھاجی۔ ایک طشتری میں کباب اور ایک میں اُبالے ہوئے انڈے۔ اور ساتھ ساتھ ایک پوٹ میں چائے۔

یا ایک غریب لڑکا ہے، وہ آیا۔ آپنے اس کو افسردہ دیکھا، پوچھا بچّے تجھے کچھ پیسے کی ضرورت ہے۔ ضرورت آئے، تو لے لیا کر۔ اسے دو روپیہ دیدیئے۔ ایک ہفتہ کے بعد دیکھا کہ اس کا جوتہ ٹوٹا ہوا ہے۔ جوتہ لے دیا، کبھی کپڑا بنوا دیا، کبھی کتابیں خرید دیں، اس طرح آپ اس پر ہر ماہ

دس بیس روپے خرچ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس غریب کو کوئی اطمینان نہیں ہوتا کہ آپ کب لطف فرمائیں گے اور کیا دیں گے اور نہ آپ خاص طور پر اس کی فکر کرتے ہیں۔ نہ اس کے ماں باپ کو تشفی ہوتی ہے۔ اگر آپ ایک دن اس کی حالت پر غور کر کے یہ فیصلہ کرلیں کہ آپ اس کو دس روپیہ ماہوار دیں گے اور مہینہ کی پہلی کو اسے بلا کر دس روپے حوالہ کر دیا کریں، تو وہ اتنے سے مطمئن ہو جائے ماں باپ کو سبکدوشی ہو، سننے والے بھی سمجھیں کہ آپ ایک کام کر رہے ہیں۔

سلیقہ سے خرچ کرنے والے کو ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے اور اس کی قدر بھی ہوتی ہے۔ بے قاعدگی سے خرچ کرنے والا خرچ تو کر دیتا ہے لیکن اس کا ظاہری اثر ہوتا ہے اور نہ باطنی۔ حاجت والوں کے دل کی یہ تشویش کہ آپ کب دیں گے اور کیا دیں گے، آپ کے دینے کی نیکی اور خوبی کو بے مزہ کر دیتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی حاجت مند کو احسان مندی کی ندامت سے بچانے کو ایسا کرنا ہوتا ہے کہ نہ اس کو معلوم ہو کہ اس پر خاص احسان کریں گے اور نہ یہ کہ لوگ سمجھیں کہ وہ کسی کا دست نگر ہے۔ اگر اس جذبے کے ماتحت بے قاعدہ طور پر کسی کے ساتھ سلوک کیا جائے، تو اس کا اجر اور بھی زیادہ ہے۔ اَلاَعمالُ بالنّیات۔ یعنی عمل کا اجر نیت کے اعتبار سے ملے گا۔

مال کا مصرف تین ہے (۱) خدا کی خوشنودی کے لئے: ـــــ مثل زکواۃ و صدقہ (۲) سخاوت اور ایثار کے طور پر تحفے تحائف میں لازم و مناسب

مواقع پر خرچ کرنا۔ (۳) اخراجات ضروریہ، جیسے کھانا پینا وغیرہ۔ کبھی مضرت دفع کرنے کی غرض سے کسی کو دینا ہوتا ہے، وہ بھی اسی قسم میں داخل ہے۔

پہلی قسم، یعنی خدا کی راہ میں صرف کرے، تو چار باتوں کا لحاظ رکھے ایک یہ کہ جو کچھ خدا کی راہ میں دے۔ خوشی اور رضامندی کے ساتھ دے کیونکہ خدا دل کو دیکھتا ہے، عالم الغیب ہے۔ اگر آپ نے جبراً قہراً خدا کی راہ میں جھنجھلا کر کچھ نکالا، تو آپ کیا توقع کرتے ہیں کہ خدا اس کو کس طرح پسند فرمائے گا اور کیسا اجر دے گا۔ دوسرے یہ کہ محض خدا کی خوشنودی مقصود خاطر ہو، نہ کہ نام و نمود یا حاجت مندوں پر احسان اور تفاخر۔ تیسری بات یہ کہ ایسے ایسے لوگوں کو ڈھونڈھ کر دے، جن کی حاجت مندی پوشیدہ ہو۔ یعنی حیاو شرم سے وہ اپنی حالت کسی کے سامنے بیان نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ بھی نہیں کہ سوال کرنے والوں کو محروم رکھا جائے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے: وَفِیْ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ یعنے محروم اور محتاج کے علاوہ سائل کا بھی حق ہے۔ سائل اور محروم میں فرق یہ ہے کہ محروم مسکین ہے۔ اس کے پاس حاجت ضروری رفع کرنے کا سامان نہیں ہے، نہ اس کو توقع ہے اور سائل وہ ہو سکتا ہے۔ جس کو حاجت آپڑی، جس کی وجہ سے وہ مانگنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ گو حقیقتہً محتاج نہیں ہے اور عموماً تو محتاج ہی سائل ہوتے ہیں چوتھی بات یہ کہ اگر کسی ایسے کو پیسہ دے، جس کی غربت اور فلاکت کا حال

اگر دوسروں سے پوشیدہ ہے، تو اس کی پردہ دری نہ کرے۔

دوسری قسم سخاوت و ایثار کے طور پر، جو کچھ خرچ کرے۔ اس میں پانچ باتوں کا خیال رکھے۔ اول یہ کہ کسی کی حاجت روائی کرنے میں جلدی کرے تاکہ حاجت مند کو امداد کے انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے اور دوسرے یہ کہ افشائے راز کا ضرور خیال کرے۔ کیونکہ حاجت روائی کرکے دوسروں کی نگاہوں میں حقیر کر دینا۔ استحقاق ثواب زیادہ خدا کی ناخوشی کا باعث ہو سکتا ہے اس لئے کہ خدائے تعالیٰ کو حاجت والوں کے دل کے احساس کا زیادہ خیال رہتا ہے دل ان کا اگر بجائے مسرور ہونے کے افسردہ اور نادم ہو گیا، تو اجر کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ دیتے وقت حقارت اور ذلّت آمیز الفاظ استعمال نہ ہوں اور نہ ایسا تیور رکھا جائے۔ چوتھے یہ کہ اگر ایک دفعہ کسی کی حاجت روائی کی، تو اس کی حاجت روائی کا خیال رکھا جائے کہ جب جب موقع ہو اس کو وقت پر مدد پہنچائی جائے۔ کیونکہ امید بندھ جانے کے بعد مایوسی پیدا ہو جانا برا ہوتا ہے اور حاجت مند کے دل کو افسردہ کر دیتا ہے۔ پانچویں یہ کہ ٹھیک موقع اور محل کا خیال رکھا جائے، جیسے کہ بالفرض کسی کی لڑکی کی شادی ہے۔ اس کی رخصتی کے بعد آپ کو یاد آیا کہ ہاں اس غریب کی کچھ مدد کرنی ہے۔ آپ نے جاکر اس کو دس روپیہ عنایت کئے اور کہا کہ آپ کی لڑکی کی شادی تھی مجھے آپ کی اعانت کرنی ہے۔ اس لئے یہ رقم حاضر ہے۔ یہ ویسا ہی ہوا

کہ فصل گذر جانے کے بعد دانہ زمین پر چھینٹا گیا۔

تیسری قسم میں اگر دفع مضرت کے لئے دینا ہے، تو اس میں اس امر کا اختیار رہے کہ اتنا زیادہ نہ دیا جائے کہ مانگنے والے کی طمع بہت زیادہ بڑھ جائے اور اس مد میں بالآخر اسراف کرنا پڑے اور دھمکیاں زیادہ ہونے لگیں اور جو کچھ گھر والوں کے خورش پوشش میں صرف کیا جائے۔ اس میں خیال رہے کہ ایسا نہ ہو کہ تکلیف اٹھانے کے بعد ان کو ضرورت کی چیز کی اگر حیثیت ہو تو فراخدلی کے ساتھ اپنے گھر والوں پر صرف کرے، نہ کہ کنجوسی کے ساتھ۔ کیونکہ فراخدلی کا خرچ اگرچہ اسراف کے قریب ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے خلوص اور محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ برخلاف کنجوسی کے کہ اس سے نفرت بڑھتی ہے بددلی پیدا ہوتی ہے، بدگمانیاں ہونے لگتی ہیں۔ زندگی کا لطف جاتا رہتا ہے۔ خیر الامور اوساطہا۔ ہر موقع پر صحیح ہے یعنی ہر امر کا اوسط بہتر ہے۔ اعتدال تمام عمل میں لازمی ہے۔

عورت

خالق عالم نے مرد کا شریک زندگی عورت ہی کو بنایا ہے اور اپنی حکمت کاملہ سے ایسا انتظام قائم کیا ہے کہ لطف زندگی عورت اور مرد دونوں کے اشتراک پر موقوف ہو گیا ہے۔ منفرد زندگی بسر کرنا نہ مرد کو زیبا ہے اور نہ عورت کو شایان۔ یہی تقاضائے فطرت ہے اور یہی سائنس ہے اور یہی حکمت اور فلسفہ اقتصادیات کا دارومدار بھی اسی پر ہے۔ عجیب حکمت ہے کہ ایک کے ساتھ بقائے نفس کو منسلک کر دیا ہے اور دوسرے کے ساتھ بقائے نسل کو یعنی مرد میں وہ ساری خوبیاں اور وہ سارے مادے اور ساری صلاحیتیں جمع کر دی ہیں، جن سے کسب معیشت میں مدد لی جا سکتی ہے اور بچوں کی تخلیق ان کا نمو اور ان کی غذا اور پرورش کا پورا انتظام عورت کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔

مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ جب دور حاضر کے تعلیم یافتہ اور صاحب فکر و تدبیر اشخاص یہ تحریک پیش کرتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کو امور سیاست میں

برابر کا حصہ لینا چاہیئے۔ میں سوچنے لگتا ہوں کہ وہ جب سیاست مُدن کے مسائل سوچتے ہیں، تو شاید وہ فلسفہ توالد اور حکمت بقائے نسل انسانی کو بھول جاتے ہیں۔ سیاست کی غرض امن عامہ قائم کرنا ہے۔ لیکن انسان کو بقائے نسل انسانی کے لوازم کو بھی سوچنا ہے۔ بی صاحبہ اسمبلی کے ڈیبیٹ میں مشغول تو بچہ کو دودھ کون پلاتا ہے۔ آپ فرمائیں گے کہ بکری کا دودھ شیر کش کے ذریعہ سے پلایا جائے گا اور ایک دایہ ہوگی، وہ نگرانی کرے گی، پھر دایہ حقوق کی پامالی ہوتی ہے، وہ بھی اسمبلی کی ممبر کیوں نہ ہوگی۔ ہر عاقل اور بالغ کا حق ہے کہ سیاست میں حصّہ لے۔ اور دودھ، فطرت نے تو اس کی ماں کی چھاتی میں عطا فرمایا تھا۔ اب اس کو ضائع کریں گے اور بکری کے تھن سے نکال کر آدمی کے بچوں کو دیا جائے گا۔ مجھے تو یہ فطرت کی مخالفت اور عقل کی دشمنی معلوم ہوتی ہے۔

انسان کے انتظامات کے دو مرکز ہیں۔ اس میں سب سے اول اور ضروری تدبیر منزل۔ دوسرا اہم اور لازمی سیاست مدن ہے۔ تدبیر منزل کے لئے عورت کو مخصوص ہونا چاہیئے اور سیاست مدن کے لئے مرد کو

مرد ہر وقت اور ہر روز اپنی زندگی میں اس لائق ہوتا ہے کہ وہ کوشش و محبت سعی اور تدبیر میں لگ جائے۔ جنگ کے میدان میں اتر پڑے۔ بوقت ضرورت معرکے پہ پہنچ جائے۔ لیکن عورت کی تخلیق ایسی ہے کہ اکثر اس کو فطری مجبوریاں لاحق ہوتی ہیں۔ وہ سختی اور محنت کے کام میں نہیں

لگ سکتی اور اگر اس سے محنت کا کام لیا جائے، تو نسل انسانی کمزور ہو، یا تلف ہو جائے۔ اولاد کی پرورش اور پرداخت کا کام عورت کے لئے کم اہم نہیں ہے۔ تفریح طبع کے طور پر وہ کوئی دوسرا مشغلہ خانہ داری کے علاوہ کر سکتی ہے۔ لیکن ان کو بیرونی کام کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

کچھ عورتیں ایسی ہوتی ہیں، جو لوازم پرورش سے آزاد ہوتی ہیں اگرچہ کوئی عورت اس سے خوش نہیں ہوتی کہ اس کو اولاد یا پرورش اولاد کی خدمت نہ حاصل ہو۔ لیکن ایسی عورتوں کو اگر دوسرے کاموں میں لگایا جائے، تو مناسب ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ تخیل کہ عورت مردوں کے پہلو بہ پہلو کام کرنے پر مجبور کی جائے، ظلم ہے اور اگر عورت اس کا اعادہ کرتی ہے، تو اس کی نادانی ہے۔

عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ ان کو سیاسی کاموں کے لائق نہ سمجھنا احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ میرے خیال میں عورت ایک ایسی مخلوق ہے، جو مستحق ہے کہ نہایت آرام و سکون سے رکھی جائے اور مرد محنت و مشقت برداشت کر کے اس کی ضرورتِ زندگی بہم پہنچائیں۔ یہ تخیل ان کے احترام، ان کی عظمت اور شفقت کی بناء پہ ہے۔ عورتیں جب اونٹ پر سوار ہوتیں، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تیز ہانکنے سے منع فرماتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے "قواریرا، قواریرہ" کہ شیشے جیسی نازک ہستیاں

ہیں۔ اس کے جسم کو زیادہ حرکت نہ پہنچے۔ اور اطبّا بھی اس کو تائید کرتے ہیں کہ عورت کو جسمانی مشقّت کے کام نہ دیئے جائیں۔

ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ عورت ایک عضوِ معطل تصور کی جائے۔ یا اچھوت کا رتبہ دیدیا جائے، یا دائی کا۔ ان کو جسمانی ورزش کا بھی موقع نہ ملے اور تعلیم سے ان کو الگ تھلگ رکھا جائے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے۔ عورتوں کو مردوں سے پیچھے رکھنا انصاف نہیں ہے۔ ہمارے لئے تو طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ یعنے علم ہر مسلم مرد اور مسلمہ عورت کے لئے فرض ہے۔ اس میں کوئی قید علم دین اور علم خانہ داری کی نہیں۔ مگر علم دین اور علم خانہ داری تو ان کا پیدائشی فریضہ ہے۔ ان کو نسل انسانی کی تو ابتدائی تعلیم دینا ہے اور اسے اس طرح روح و دماغ پر راسخ کرنا ہے، جو زندگی بھر کام آئے۔ مجھے آج تک بعض مسائل طہارت اور نماز والدہ مرحومہ کے بتلائے ہوئے یاد ہیں۔ گو وہ پڑھی لکھی عورت نہ تھیں۔ لیکن اتنی واقفیت ضرور تھی کہ اپنی اولاد کو ضروری مسائل بتا دیتیں۔ مردوں کی بے علمی اور ناشائستگی کی ذمہ داری ماں کی صلاحیتِ تربیت پر ہے۔

الغرض تدبیر منزل کے لئے ایک عورت کا شریک حال ہونا لازمی ہے اس لئے میں عورت کے اکثر حالات اور عورت کے انتخاب کا بہترین طریقہ درج کروں گا۔ کیونکہ اسی پر ایک مرد کی زندگی کے خوشگوار یا ناخوشگوار ہونے

کا انحصار ہے۔ اس میں غلطی برتنے سے ہمیشہ کے لئے کُلفت برداشت کرنی پڑتی ہے اور واقعی یہ رشتہ ایسا ہے، جو زندگی بھر قائم رہتا ہے اور حقیقتہً اس میں انفعال کی گنجائش نہیں۔ جہاں جہاں افتراق کا اتفاق ہوتا ہے وہاں چند غیر فطری عمل کی ضرورت پڑتی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایک مرد اپنی عورت سے افتراق کر رہا ہے، تو پہلی دقت یہ ہے کہ اولاد کی پرورش کے لئے کوئی ایسی صورت قائم ہونی محال ہوتی ہے کہ کوئی ایسی عورت ملے، جس کو بچّہ سے خُلقی محبت ہو۔ اور اگر مرد نے خود یہ خدمت انجام دی تو یہ بھی غیر فطری ہے۔ مرد اس لائق ہی نہیں بنا ہے کہ وہ بچّوں کے جذبات کا صحیح احساس کرے۔ یا یہ کہ بچّوں کو مرد کی گود میں ویسا ہی سکون پیدا ہو، جیسا ماں کی گود میں۔ کیونکہ بچّے کو ماں کی گود میں صرف ممتا ہی نہیں ملتی، بلکہ غذائے جسمانی بھی موجود رہتی ہے۔ جس کی طرف مائل ہو کر وہ اپنے غصّے اور ضد کو بھول جاتے ہیں۔ صدقے جائیں اس قدرت کے جس نے اتنے سامان مہیّا کئے ہیں۔ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ رشتہ ناقابل انفصال ہے۔ یوں تو کبھی کبھی مجبوراً اپنے ہاتھ پاؤں بھی کٹوانے پڑتے ہیں۔ لیکن خدا انسان کو ایسی مجبوریوں سے محفوظ رکھے۔

سب سے پہلے مجھے یہ امر ظاہر کر دینا ہے کہ ایک عورت ظاہری خوبیوں اور اضافی بہتریوں کے لحاظ سے لائق پسند نہیں ہوتی۔ یعنی اس لئے کہ ایک عورت بہت خوبصورت ہے، یا ایک دولت مند کی لڑکی ہے پسند ہی نہیں کی جا سکتی

کیونکہ یہ دونوں عورتیں ایک شوہر کے لئے خطرناک ہیں۔ حسن کا خطرہ بتانے میں مجھے زیادہ صراحت کرنی نہیں ہے۔ کیونکہ ہر نوجوان "بیسویں صدی" میں ایسے ایسے افسانے پڑھتا رہتا ہے، جس سے اس کو بخوبی معلوم ہے کہ دل پھینکنے والے حُسن کے پیچھے کس طرح دیوانے ہو جاتے ہیں۔ جان بوجھ کر یہ بلا کون خریدے ہاں اگر اس کے ساتھ عفت، عصمت، خدا ترسی، حیا، تحمل اور پیش بینی کے صفات سے منسلک ہو، تو کیا کہنا۔ انسان کی تمام صفتوں میں حیا ایک ایسی ہی صفت ہے، جو تمام اوصاف حمیدہ کی ماں ہے اور عورت کے لئے یہ ایسا زیور ہے، جو عورت کو فرشتہ بنا دیتی ہے۔ اور اگر یہ ایک صفت نہیں، تو عورت نہیں ہے۔ آفت ہے۔ بلا ہے، جہنم کی آگ ہے۔

دولتمند عورت سے ایک شوہر یہ توقع نہیں رکھ سکتا ہے کہ اس کو مطیع بنا کر گھر بار کا سارا کام اپنی مرضی کے موافق چلا سکے گا۔ کیونکہ اکثر دولتمند عورتیں ایسی ہوتی ہیں، جو شوہر کو غلام سمجھتی ہے۔ میں یہ محض اپنی رائے نہیں لکھ رہا ہوں۔ بلکہ میرے سامنے اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی موجود ہے دونوں حکمائے اخلاق اس امر پر متفق ہیں۔ میں نے تو ایسا بھی دیکھا ہے کہ بعض دولتمند بیوی، غریب شوہر کی اس قدر مطیع ہوتی ہے کہ کوئی زر خرید لونڈی بھی نہیں ہوگی۔ لیکن یہ امر اتفاقی ہے۔

میرے بھائی صاحب مرحوم کی پہلی شادی ایک نہایت امیر کبیر کی

لڑکی سے ہوئی تھی۔ میں بھاوج کے گھر رہتا تھا۔ اُن سے پیسے لیتا تھا اور ان ہی کی روٹیاں کھاتا تھا۔ میں اس وقت مشکل سے پندرہ سال کا ہوگا۔ بھائی صاحب مرحوم سفر حج کو تشریف لے گئے اور میں صاحب خانہ بن گیا۔ میں نے چند فرمان جاری کر دیئے۔ یہاں تک کہ بھاوج کے بعض رشتہ دار عورتوں کی آمد و رفت بند کر دی۔ وہ چاہتیں تو مجھے نوکروں سے نکلوا دیتیں۔ لیکن کسی بات کی خلاف ورزی نہ کی اور مجھ سے کسی طرح کی رنجش کا اظہار نہ کیا۔ جب بھائی صاحب سفر حج سے واپس تشریف لائے یہ مقدمہ ان کے سامنے نہایت خوش مزاجی اور مذاق کے طور پر پیش ہوا۔ بھائی صاحب ہنس پڑے اور فیصلہ میری رائے کے خلاف صادر فرمایا، اور کہا کہ یہ بچپنہ تھا۔ بھابی مرحومہ نے مجھ سے اسی قدر بدلہ لیا کہ ہنس کر مجھے سلام کیا، جس سے میں عرق عرق ہو گیا اور شرمندگی محسوس کی۔ مگر ان کے اخلاق میں کوئی فرق نہ آیا۔ ایسا بھی ہوتا ہے، مگر بہت کم۔

مسئلہ ازدواج میں شرعاً کفو کی بحث آ جاتی ہے۔ اس لئے میں لفظ کفو کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میرے خیال میں اس میں مسلمانوں کو غلط فہمی ہو گئی ہے۔ عموماً کفو خاندان اور نسب کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں یہاں پر نسب کی رعایت کی مخالفت نہیں کرتا، لیکن کفو کے صحیح معنی بتا دینا چاہتا ہوں۔ کفو کے معنی ہیں مقابل۔ شادی بیاہ میں اس کا

لحاظ رکھنا جائے، کہ جس گھرانے سے رشتہ قائم کیا جا رہا ہے، اس کا رہن سہن معاشرت، اور اخلاق میں مقابلہ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ ایک امیر گھر میں جب ایک غریب لڑکی آجاتی ہے، تو گھر کی مامائیں اس کو اپنی سطح میں سمجھنے لگتی ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساس، نند بھی اس کی غربت کا طنز کرتی ہیں "اپنے گھر کبھی یہ دیکھا تھا"۔ "تمہارے میکے میں بھی یہ ہوتا ہے" اس سے لڑکی کی نہایت دل شکنی ہوتی ہے اور وہ بیزار ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جب دولتمند گھرانے کی لڑکی کسی غریب کے گھر آتی ہے تو اس کو وہ گھر کاٹے کھاتا ہے، شوہر تعلیم یافتہ ہو، بڑی بڑی ڈگریاں موجود ہوں۔ لیکن اگر اس کو گھر کے اندر رہائش کے سامان نظر نہیں آتے۔ ہوادار، پُرفضا مکان نہیں ملتا، صاف ستھرے لوگ نہیں ملتے، تو وہ اس گھر کو آباد نہیں کر سکتی۔ اس کی نظر میں ساس، نند دائی ماما کی سی معلوم ہوتی ہیں اور برابر بولتی رہتی ہے۔ یہاں بجلی کا پنکھا نہیں۔ غسلخانے میں پائپ نہیں۔ گھر دروازہ، صاف ستھرا رکھنے والی دائیاں نہیں۔ غرض کہ بے جوڑ شادیاں ہمیشہ بے لطف ہوتی ہیں۔ رہائش کی یکسانیت، رسم و رواج کی موافقت، عقیدے اور خیالات کی ہم آہنگی، یہ ساری چیزیں درکار ہیں اور ایسی ہی مطابقت کو کفو کہتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ لفظ کفو نسب کے لئے مخصوص ہرگز نہیں۔ بلکہ نسب میں اگر مساوات نہ ہو اور معاشرت

میں ہو تو زیادہ سو مزاجی نہیں ہوگی۔

اچھی عورت وہی ہے، جو باحیا باعصمت، متحمل، منکسر مزاج، نرم دل سخی اور شریف النفس ہوتی ہے اور ان صفتوں کے ساتھ اگر دولت وحسن بھی ہو تو اس سے بڑھ کر کیا چاہیئے۔ تعلیم اگر زیادہ نہ ہو تو کم از کم اپنی مادری زبان میں لکھنے پڑھنے، حساب کتاب کی صلاحیت ہو۔ افسوس یہ ہے کہ آج بھی کچھ ایسی شریف عورتیں موجود ہیں، جو گھر کا خرچ لکھوانے میں دوسروں کی محتاج ہیں۔ ان سے ہر سلیقہ خانہ داری کی کہاں تک امید کی جا سکتی ہے۔

پانچ قسم کی عورتیں ہوتی ہیں، جن سے پرہیز کرنا لازم ہے۔ ایک وہ جس کو پہلے شوہر سے اولاد ہو۔ کیونکہ فطرۃً وہ اس کی محبت میں زیادہ مبتلا رہے گی۔ دوسری وہ، بیوہ عورت جس کا پہلا شوہر بعض اعتبار سے موجودہ شخص سے بہتر ہو۔ کیونکہ وہ ہر وقت اپنے پہلے شوہر سے مقابلہ کرتی رہے گی۔ اور یقیناً وہ بیدل رہا کرے گی۔ تیسری وہ خود دولتمند ہو اور شوہر کو اس کا دست نگر رہنا پڑے۔ چوتھی بدگوئی کرنے والی، جس سے یہ امید کی جائے کہ وہ شوہر کی شکایت کرنے میں دریغ نہ کرے گی۔ پانچویں وہ جس کی بدچلنی ظاہر ہو چکی تھی۔

جب تک عورت کی حالت قریب سے نہ دیکھی جائے۔ باطمینان انتخاب نہیں ہو سکتا ہے۔ اس لئے عموماً قریبی رشتہ داروں میں شادی بیاہ کرنا

بہتر ہے۔ ورنہ ایسے مواقع نکالنے پڑیں گے، جس سے عورت کی حالت دریافت ہوسکے۔ ماں باپ کو لازم ہے کہ رشتہ جوڑنے سے پہلے۔ پوری دیکھ بھال کرلیں۔ یہ رسم تو واقعی معیوب ہے کہ شادی کے قبل زن وشو کو ملنے جلنے کا موقع دیا جائے۔ لیکن کسی عنوان سے ایک نگاہ دیکھ لینا زیادہ محتاط ہے۔ میں نے بہار میں یہ رسم دیکھی تھی کہ عموماً عقد نکاح کے بعد ایک شب نوشہ سے صرف رسوم کرائے جاتے تھے اور دوسری شب میں خلوت ہوا کرتی تھی۔ پہلی شب میں اور رسوم کے ساتھ یہ رسم تھی کہ سامنے آئینہ رکھ دیا جاتا تھا اور دولہا اور دُلہن کو ساتھ بٹھا کر آگے ایک چادر گھیر دی جاتی تھی اور مشاطہ اور بعض رشتہ دار عورتیں جن سے ہنسی دلگی کا رشتہ ہوتا، وہ تلقین کرتیں کہ آنکھیں کھول کر دونوں آئینہ میں ایک دوسرے کو دیکھ لیں اور اسی مضمون کے گیت بھی گائے جاتے۔ تقریباً نصف گھنٹہ اس طرح رکھا جاتا ہے۔ اس میں یہ مصلحت ہے کہ دونوں خلوت سے پہلے ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھ لیں اور اگر ظاہری شکل وصورت قابل نفرت ہو تو۔ اس کا اظہار کرسکیں۔ اب زمانہ ترقی کرگیا ہے اگر ایک دوسرے کی تصویریں والدین کی رضامندی سے ایک دوسرے کو دکھا دی جائے تو مجھے مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مگر یہ نہیں کہ تصویریں بھی تمام نوجوانوں میں پھرنے لگیں۔ ان ہی ساری باتوں کے طے ہوجانے کے بعد

بلکہ عقد نکاح کے بعد بھی اگر یہ رسم ادا کردی جائے، تو خلوت سے پہلے کوئی فیصلہ ہوسکتا ہے اور اگر خدانخواستہ ناپسندیدگی کے آثار ہوں تو، اسی وقت اس کا تدارک کرلینا بہتر ہے۔ برخلاف اس کے کہ شادی کے بعد نوشہ دلہن کے پاس جانے سے انکار کررہا ہے اور دوست احباب، عزیز واقارب فہمائش کریں اور کسی طرح راضی کیا جائے۔ ایک صحابیؓ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے عرض کیا کہ میں فلاں عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ حضور نے فرمایا کہ اسے دیکھا بھی ہے، کہا نہیں۔ حکم ہوا کہ دیکھ لو۔ وہ اس عورت کے پاس تشریف لے گئے اور حکم نبویؐ سے مطلع کرکے دیکھنا چاہا، تو اس دین دار صحابیہ نے فرمایا کہ اگر حضرت کا حکم نہ ہوتا، تو میں اپنا چہرہ کسی غیر محرم کو قبل نکاح نہ دکھاتی۔ یہ ہے تعلیم دین محمدیؐ۔ کاش کہ ہم سچے مسلمان ہوتے۔ اور سنّت پر عمل کرنے کی توفیق ہوتی۔ آج تو دین کے نام پر ہنسی ہوتی ہے۔ میں بھی یہ ڈر ڈر کر لکھ رہا ہوں۔ اندیشہ ہو رہا ہے کہ اسی حیلہ سے تصویر بازی نہ جاری ہو، پھر نتیجہ کورٹ شپ تک پہنچ جائے۔ اور مواخذہ میرے سر رہے۔ جاننا چاہیئے کہ اعتدال کا نام دین ہے اعتدال سے تجاوز کرنا، اِدھر ہو یا اُدھر گمراہی ہے۔

بیاہ ہوجانے پر، شوہر کو ان امور کا لحاظ رکھنا ضرور ہے (۱) اپنی ہیبت اور رُعب قائم رکھنا (۲) سخاوت اور محبت برتنا (۳) بیوی کو

کسی شغل میں مشغول رکھتا۔ اوّل اگر علم دوست ہے، تو فطرۃً اس کا اثر اس پر پڑتا رہے گا۔ لیکن پھر بھی واہی تباہی باتیں کرنے سے رُعب جاتا رہتا ہے۔ اپنی کمزوریاں کبھی عورت پر ظاہر نہ ہونے دے۔ اگر غریب بھی ہو تو حتی الوسع یہ نہ ظاہر کرے کہ وہ بے ساز و سامان ہے، موجودہ ناداری کا اثر مستقبل کی امیدوں سے زائل کرتا رہے اور در پردہ اپنی کمزوریاں دفع کرتا جائے۔ اور ضروریاتِ زندگی کی فکر میں لگا رہے۔ جب عورت کی نگاہ میں شوہر ناکارہ ثابت ہو جاتا ہے، تو اس کی کوئی وقعت اس کے دل میں نہیں رہتی۔ اس لئے اس کی فرماں برداری اور حکم کی بجا آوری سے بے التفاتی کرنے لگتی ہے۔ دل کی تمام اچھی بُری باتیں بیوی سے نہ کہے۔ ایسی ہی باتیں کہے جس سے وقار باقی رہے اور خود بھی بیوی تمام راز کی باتیں دریافت کرنے کے ٹوہ میں نہ لگ جائے۔ کیونکہ انسان مرد ہو یا عورت کچھ نہ کچھ اپنی فطرت میں کمزوریاں رکھتا ہے۔ اس کے ظاہر ہونے سے دوسرے کے سامنے وقعت کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً انسان لباس پہنتا ہے، منشا اس کا یہ ہے کہ وہ حصّہ جو دیکھتے ہیں، مکروہ نظر آتا ہے، چھپا رہے۔ اسی طرح وہ باتیں، جو فی الحقیقت مکروہ ہیں، ان کو ضرور چھپانا چاہیئے کتنا ہی مخلص دوست کیوں نہ ہو، ایک ہوش مند انسان اُس کے سامنے ننگا ہونا پسند نہیں کرتا۔ تعلیم شرعی تو یہ ہے کہ مرد اپنی عورت کے سامنے بھی برہنہ

ہو، بلکہ خود بھی اپنی ستر پر نگاہ نہ ڈالے۔ مگر اپنے عیوب پر خود تو نگاہ ضرور رکھے لیکن دوسروں کی نگاہ سے مستور رکھے۔ خدا بھی نہیں چاہتا کہ انسان اپنے گناہ کا اظہار کرے۔ گنہگار بندے اور خدا کے درمیان جو راز ہے، وہ دوسروں پر ظاہر نہ ہو۔ تاکہ خدا جب چاہے اس کو بخش دے۔ لیکن اظہار کے بعد توبہ اور ندامت کا بھی اسی طرح اظہار ہونا چاہیئے۔ تاکہ جو لوگ اس کو گنہگار جان چکے ہیں۔ لائق معافی بھی سمجھیں۔ بیوی پر شوہر کے عیوب ظاہر ہو جانے پر عورت نڈر اور بیباک ہو جاتی ہے۔

دوسری بات سخاوت اور محبّت، غریب عورت اپنا گھر بار، عزیز واقربا کو چھوڑ کر شوہر کا گھر آباد کرنے آتی ہے۔ وہ بھی محبت کی بھوکی ہے۔ ماں باپ کی ممتا کو چھوڑ آتی ہے۔ اگر اس سے شوہر محبّت اور خلوص سے باتیں نہ کرے گا، تو پھر اس کو کس کا آسرا رہے گا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ساس بھی اس سے ایسی محبّت کرے جیسا اپنی بیٹی سے کرتی ہے۔ نند بھی اس کو اتنا ہی عزیز رکھے، جتنا اپنی بہن کو، تو نئی دُلہن اس نئے گھر کو خلوص و محبت کا گھر سمجھنے لگے گی۔ اس کا دل لگ جائے گا۔ میکے کی کھوئی ہوئی فضا مل جائے گی۔ وہ بھی سب سے محبت اور فرماں برداری کا برتاؤ کرنے لگے گی۔ محبّت جس سے کی جاتی ہے، وہ بھی محبّت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ آپ سے کچھ پیسہ مانگتی ہے۔ اپنی حاجت پیش کرتی ہے اور آپ

اس کو جھڑک دیتے ہیں، تو بھلا اس کا دل کیوں نہ پھٹ جائے، جب باپ سے مانگتی تھی وہ جھڑکتے نہ تھے۔ محبت اور پیار سے کبھی کبھی ٹال جاتے لیکن اس کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش ضرور کرتے۔ آپ کے گھر آئی ہے اور کسی سے منہ کھول نہیں سکتی۔ آپ سے کچھ خلوص اور بے تکلفی ہو گئی ہے۔ وہ اپنی ضرورت پیش کرتی ہے۔ مناسب ہے کہ یا تو آپ پورا کریں اگر آپ پورا نہیں کر سکتے، تو محبت اور پیار کے ساتھ اس کو اطمینان دلائیں کہ آپ اس کی فکر کریں گے اور موقع ہاتھ آنے پر ضرور پورا کریں گے زندگی بھر کا سروکار ہے۔ چلتی پھرتی ملاقات نہیں۔ اس کو بے دل کر دینے کے بعد آپ کیا امید رکھ سکتے ہیں کہ وہ دل سے آپ کی فرماں برداری کرے۔

تیسری چیز ہے اشغال۔ آپ کو معلوم ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ گدام بن جاتا ہے۔ انسانی دماغ کبھی خالی نہیں رہ سکتا ہے۔ اس کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھنا ضرور ہے۔ ہندوستان میں ایک عجیب بات ہے۔ کسی نوجوان سے پوچھا تم کیا کرتے ہو، بولے کچھ نہیں' یہ تو ممکن نہیں کہ انسان کچھ نہ کرے، کچھ نہیں تو قسمت ہی کا گلہ کرتا رہے گا۔ خدا کی بے انصافی کا فلسفہ بیان کرے گا، کہ اوروں کو سب کچھ ہے' مجھ کو کچھ نہیں اس لئے کوئی نہ کوئی شغل رکھنا ضرور ہے۔ ایک عورت اپنے گھر سے

سسرال آتی ہے۔ گھر میں جدھر جاتی گھومتی پھرتی جو جی چاہتا کھاتی، جو خواہش ہوتی پکاتی۔ یہاں نہ اس سے کام کاج لیا جاتا ہے اور نہ مشورہ، کسی چیز میں اس کا دخل نہیں۔ باہر چلنے پھرنے سے معذور دوسروں سے ہنسنے بولنے سے مجبور، کبھی کبھی کچھ نہ کچھ سوچتی رہے گی۔ کبھی ساس کی کسی بات کو سوچ رہی ہے، کبھی نند کی، کبھی شوہر کی بے توجہی پر رو رہی ہے، کبھی ضروریات زندگی کا شکوہ ہے، کبھی محلہ والوں پر کچھ رائے زنی ہے، کسی کا شکوہ، کسی کی شکایت یہ ہو جاتا ہے اس کا دلچسپ مشغلہ اور خاص کر وہ لڑکیاں جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور جو پڑھنا لکھنا جانتی ہے' وہ افسانے پر افسانے پڑھ رہی ہیں۔ کسی افسانے کو کہا ٹھیک میرے حال کے موافق۔ کسی کو کہا، ہاں اچھا کیا غریب عورت جان نہ دے تو کیا کرے غرض یہ کہ کتابیں بھی اگر تاریخ کی ہوں۔ بڑے لوگوں کی سوانح حیات ہوں، پند و نصیحت ہوں، خانہ داری کے اصول، تدبیر منزل کا فلسفہ، تو خیر کچھ اچھے خیالات پیدا ہوں اور آگے چل کر زندگی کے لئے مفید ہوں۔

مرد کو لازم ہے کہ عورتوں کے معاملہ میں چھ چیزوں کا لحاظ رکھے۔
اول یہ کہ اس کو نہایت حسن وخوبی سے رکھے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ دوسرے یہ کہ حتی الوسع پردہ میں رکھے۔ یہ تو فلسفہ قدیم اور حکمائے متقدمین کی رائے ہے۔ موجودہ زمانے میں تو پردہ کا مسئلہ مضحکہ خیز ہے

لیکن غور سے دیکھا جائے، تو اندنوں عورتوں کے اختلاط سے اخراجات میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب ایک عورت دوسری عورتوں کی مجلس میں شریک ہوتی ہے، تو اس کو دوسری عورتوں کے مقابلے میں اپنا لباس اور اپنا سامان حقیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ عورت ذکی الحس ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے آپ کو حقیر سمجھنے لگتی ہے۔ اس لئے ہمیشہ چاہتی ہے کہ اس کا لباس دوسروں سے کمتر نہ ہو اور اپنے شوہر کی مالی حالت سے بے پروا ہو کر اپنا شوق پورا کرنا چاہتی ہے۔ برخلاف اس کے مرد ہر جگہ جاتے آتے ہیں اور ہر طرح کے لباس اور شان و شکوہ نظر آتے ہیں اس کو زیادہ تقابل کا خیال نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے در پردہ اختلاط جہاں تک کم ہو ہر لحاظ سے بہتر ہے۔

ناشائستہ عورت سے تو شریف عورت کو ضرور احتراز کرنا چاہیئے۔ عام اس سے کہ شوہر روکے یا نہ روکے، میں تو اپنے گھر دیکھتا ہوں کہ جو عورتیں بیحیائی کے ساتھ مردوں سے ملتی جلتی رہتی ہے۔ ہمارے گھر کی عورتیں ان سے ملنا پسند نہیں کرتیں۔ باوجودیکہ ہم لوگ اپنے خلوص اور ارتباط کے لحاظ سے تاکید کرتے رہتے ہیں کہ فلاں صاحب کی بیگم سے ملا جلا کرو۔ لیکن بعضوں کی عادت ہے کہ ہر ایک سے بہت ہل مل جاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ امور خانہ داری میں اس سے مشورہ کیا کریں۔ اگر

تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں فرق ہے، تو حتی الوسع کوشش کرے کہ اس کو موافق بنائے اور اگر ہر طرح سے مجبور ہو جائے، تو اختلاف کرے لیکن اکثر کام اسی کے ہاتھ انجام دلائے۔ تاکہ اس کو معاملہ فہمی کا موقعہ ملے بلکہ پیسہ اس کے سپرد کرکے اس کو ذمہ دار بنا دے۔ اس طرح امید ہے کہ اگر فضول خرچی کی طرف میلان طبع ہوگا۔ پھر بھی کفایت شعاری پر مائل ہونا ہوگا۔ اور اگر زیادہ خرچ کر ڈالے، تو زیادہ مہیا کرنے کی فکر نہ کرے، خود بھی تکلیف برداشت کرے اور بیوی کو بھی زحمت اٹھانے دے تاکہ حقیقت سمجھ میں آنے لگے۔

چوتھی بات یہ کہ بغیر کسی خاص مجبوری کے عورتوں کی خانہ داری میں دخل نہ دے۔ باورچی خانہ کا اس کو پورا ذمہ دار بنائے۔ بچوں کی ضروریات یہاں تک کہ علاج معالجہ کا بھی عورت کو پورا اختیار دے۔ اور حسب استطاعت اپنے ایک مقررہ رقم اس کے سپرد کر دے اور عموماً قرض لینے کی اجازت نہ دے اور اگر خرچ خانہ داری سے کچھ بچا رکھے تو اس سے ہرگز تعرض نہ کرے اور مقررہ رقم میں کمی نہ کرے اور اس طرح سے بچا یا ہوا پیسہ بغیر کسی سخت مجبوری کے اس سے لینے کا کبھی ارادہ نہ کرے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ بیوی کے عزیز و اقربا کے ساتھ بھی وہی برتاؤ کرے جیسا وہ چاہتا ہو کہ بیوی اس کے اپنے اقربا کے ساتھ کرے۔ یعنی اگر یہ

خواہش رکھتا ہو کہ بیوی شوہر کے ماں باپ کی خدمت گزاری کرتی رہی، تو اس کو موقع دے، وہ اپنے ماں باپ کی بھی خدمت کر سکے۔ آپ اس کے ماں باپ کے ساتھ محبت برتیں گے، تو وہ بھی آپکے ماں باپ کے ساتھ بُرا سلوک ہرگز نہیں کر سکتی۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بھائی آجائے، تو آپ کی بیوی مسرور ہو کر اس کی خاطر و تواضع کرنے لگے تو آپ کو چاہیئے کہ جب اس کا بھائی آئے تو آپ ترش روی یا تکدر نہ برتیں۔

میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بیوی کو اپنے بھائی بہن کے ہاں شادی و غمی میں شرکت کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ لیکن جب اس کے میکے سے کوئی نوید آیا، آگ بگولہ ہو گئے کہ خرچ کا سامان پیدا ہوا۔ مانجہ بھی ہے اور چوک بھی۔ خرچ آمد و رفت کے علاوہ تحفہ تحائف بھی چاہیئے۔ مجھ سے تو نہ ہوگا۔ میں تباہ ہو جاؤں گا اور اپنی بھانجی اور بھتیجی کی شادی میں قریب قریب پورا خرچ اپنے ذمّہ لے لیا۔ اور گھر بار چھوڑ کر چار مہینہ بھائی بہن کے گھر بیٹھیں گے۔ بیوی کو انتظام میں لگایا اور خود بھی لگے رہے۔ پوری مساوات تو برتی نہیں جا سکتی ہے۔ کیونکہ اپنا پیسہ اپنے لوگوں میں خرچ کرنے کا زیادہ حق ہے۔ لیکن وہ خود اپنے آپ کو آپ کی خانہ داری کا شریک سمجھتی ہے اس کے جذبات اور احساسات کا لحاظ رکھنا ضرور ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ اگر بیوی شائستہ ہو تو، اس پر سوکن لانے کا

ارادہ نہ کرے۔ کیونکہ رشک ایک امر فطری ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ بیوی کسی دوسرے مرد سے ہنس کر بولے بھی نہیں اور آپ دوسری بیوی کے ساتھ لطف و محبت کے برتاؤ جاری کریں گے تو یقیناً شاق گذرے گا اور اگر اتفاق ہو کہ دو بیویاں ہو جائیں، تو ہرگز کسی ایک کو اس کا موقع نہ دیں کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ دوسری سے زیادہ محبت ہے، یا اس کے اطوار زیادہ پسند آتے ہیں۔ دو، یا چار بیوی کی اجازت بشرط عدل ہے۔ کیونکہ فرمایا ہے کہ فَاِنْ لَّمْ تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً، یعنی اگر عدل نہ کر سکو، تو ایک ہی۔ یہ حکم قرآنی ہے۔

در کفِ جام شریعت در کفِ سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

یعنی ایک ہاتھ میں شریعت کا نازک جام بلوری ہے اور دوسرے ہاتھ میں عشق کا ہتھوڑا۔ ہر کس و ناکس جام اور ہتھوڑے سے کھیل نہیں سکتا ایک کو دوسرے سے بچانا دشوار ہو جاتا ہے۔

مرد تین باتوں کا احتیاط ضرور کرے۔ اول یہ کہ عورت پر ہرگز یہ ظاہر نہ کرے کہ وہ سب سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ ماں باپ، بھائی بہن سب سے زیادہ بیوی محبوب ہے۔ کیونکہ جب عورتوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ مرد زنجیر محبت میں گرفتار ہو گیا ہے، تو مردوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے

لگتی ہے۔ ایسی حالت میں امور خانہ داری میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ عشق ہو جائے، تو اس سے حتی الوسع بچیئے اور عشق کا علاج، جو کتب طب میں درج ہے عمل میں لائے۔ عشق خدا کے سوا کسی اور سے اچھا نہیں، بلکہ خدا کا عشق بھی اکثر مجذوب بنا دیتا ہے اور انسان اعمال حسنہ سے معذور ہو جاتا ہے اور فرائض تک ترک کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عورت میں اگر عفت، حیا، شوہر کی دولت پر قناعت، شوہر کا ڈر اور اس سے محبت، تحمّل اور انکساری ہو، اور خود غرضی، حرص و ہوا، بے حیائی، نازک مزاجی نہ ہو تو، عورت بیک وقت ماں، دوست، اور لونڈی تینوں ہے۔ ماں کی طرح بے غرض محبّت کرنی چاہیے گی۔ دوست کی طرح ہمیشہ کُلفت اور اندیشہ و فکر بدنامی اور خطرے سے بچاتی رہیگی اور لونڈی کی طرح کام کاج میں لگی رہے گی۔ اسی طرح زن ناشائستہ بیک وقت ظالم بادشاہ، چور اور درندہ کے مشابہ ہے۔ بادشاہ ظالم کی طرح ہر وقت گھر میں ایک ھنگامہ برپا رکھے گی، کسی کو ڈانٹ، کسی کو ڈپٹ کسی کو مار، کسی کو پیٹ، چور کی مانند اس لئے کہ اس کی دولت کو ہمیشہ اس کی نظر سے چھپا کر اپنی خواہشِ نفس کے پورا کرنے میں لگاتی رہے گی۔ دوسروں کو دیتی رہے گی اور درندہ اس لحاظ سے ہمیشہ اس کو تباہ اور ہلاک کرنے کی فکر میں لگی رہے گی۔ یہاں تک دیکھا گیا ہے کہ کتنوں کو

عورت نے زہر دے دیا، کتنوں کو اپنے دوست آشنا سے ہلاک کرا دیا خدا ایسی عورت سے محفوظ رکھے اور جوں ہی احساس ہو کہ عورت خطرناک ہے فوراً ہی اس سے خلاصی حاصل کرے، اس میں کسی طرح دیر نہ ہونے دے ورنہ نتیجہ خطرناک ہوگا۔

ممکن ہے داد و دہش سے بدمزاج عورت کو خوش کر سکے، یا اس سے محبت زیادہ برتے، تاکہ طبیعت اس کی نرم ہو اور امیدیں منفعت کی زیادہ ہوں۔ ناشائستہ عورتیں حریص ہوتی ہیں۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو اس کی حرص پوری کرنے کی کوشش کرے اور اگر زیادہ مال دینے کی وجہ سے مزاج میں تیزی اور ناشائستگی پیدا ہو گئی ہو تو ہاتھ روک لے۔ کبھی کبھی توجہ کم کرنے سے بھی سرکشی رفع ہو جاتی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے، کہ اگر سرکشی کرے، تو عورت سے کنارہ کشی اختیار کر کے دیکھا جائے اور آخری تدبیر یہ ہے کہ اس کے اپنے یگانوں کو تنبیہ اور ہدایت کے لئے متوجہ کیا جائے۔ ساری تدبیریں ناکام ہوں تو علیحدگی اختیار کرنے پر تامّل نہ کرے۔

دوسری بات یہ کہ ہر کام میں عورت سے مشورہ نہ لے اور ہر راز کو ظاہر نہ کرے اور اپنے تمام سرمایہ کا پورا پورا حساب نہ دے اور بالخصوص اپنی کمزوریاں اس پر ظاہر نہ کرے۔ خلیفہ منصور کا ایک غلام تھا جس پر وہ پورا پورا بھروسہ کرتا تھا۔ ایک دن خلیفہ غلام کے سامنے بولا کہ عورتوں کو رازدار نہ بنانا چاہیئے

اس نے کہا کہ حضور میری بیوی بہت شائستہ اور قابل اعتبار ہے۔ وہ کبھی میرے خلاف نہیں کر سکتی۔ خلیفہ نے کہا نہیں اس کو آزماؤ۔ غلام نے کہا کہ اکثر اس کو آزما چکا ہوں۔ خلیفہ نے کہا نہیں ایک دفعہ اور۔ اس نے اپنے خزانے سے ایک توڑا روپیہ کا دیا اور کہا کہ لے جاؤ۔ اس کو اپنی بیوی کے حوالہ کرو اور کہو کہ شاہی خزانے سے اس کو چرا کر لایا ہوں، کسی سے نہ کہنا۔ بیوی نے کسی سے نہ کہا اور رکھ دیا۔ کچھ دنوں کے بعد بادشاہ نے ایک جاریہ یعنی زرخرید لونڈی دی اور بیوی سے کہا کہ بادشاہ نے یہ عورت دی ہے کہ اس کو اپنے گھر رکھو۔ بیوی نے کہا کہ ہاں بہتر ہے اس کو فروخت کر دو۔ اس سے کچھ سرمایہ حاصل ہو جائے گا۔ غلام نے کہا نہیں بادشاہ کا حکم ہے کہ اس کو فروخت نہ کرنا، اپنے گھر رکھنا۔ تھوڑے ہی دن گزرے کہ غلام کی بیوی کو اس عورت کا رشک برداشت نہ ہو سکا۔ ایک شب کو شاہی خزانہ کا توڑہ لئے ہوئے خلیفہ کے پاس پہنچی کہ آپ کے غلام نے آپ کے خزانے سے یہ چوری کی ہے۔ خلیفہ نے بڑی ناراضگی دکھائی۔ دوسرے روز غلام کو بلا کر وہ توڑہ دیا کہ لو یہ تمہاری معتبر بیوی میرے پاس لائی اور کہا کہ یہ آپ کے خزانہ سے آپ کا غلام لے گیا تھا۔ خلیفہ کہنے لگا کہ دیکھا عورت پر پورا اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ اس قصہ سے یہ معلوم ہوا کہ عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے، لیکن سوکن سوگ نہیں برداشت کر سکتی ہے۔

خوش نصیب ہیں وہ عورتیں، جو سوکن کے ساتھ بھی بسر کر لیتی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے۔ بعض نیک طینت عورتیں اپنی سوکن کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے، جو بہن نہیں کر سکتی۔

تیسری بات یہ کہ لغویات کی عادت نہ ہونے دے، جیسے آجکل سینما اور مجلس اور زیارت کی نمائش اور زیادہ سیر و تفریح کا عادی نہ بنائے۔ میں نے دیکھا ہے۔ خود تو خرچ کی مجبوری سے نہ جائے۔ لیکن بی بی صاحبہ ہر سال دارجلنگ اور مسوری ضرور تشریف لے جائیں۔ سگریٹ، بیڑی، سگار وغیرہ کی عادت بھی نہ لگائے اور شراب تو بدترین شئے ہے، اس سے اپنے کو خود بھی محفوظ رکھے۔ ہر انسان کو اس کی نفرت دلائے، بلکہ خدا سے التجا کرتا رہے کہ کسی انسان کو اس کی عادت نہ ہو۔

سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ خود بھی دین و مذہب کی طرف مائل رہے اور اپنے گھر والوں کو بھی مائل رکھے۔ یہ ساری برائیوں سے نجات دلانیوالی چیز ہے اور آخرت کے عذاب سے محفوظ رکھنے والی بھی۔

مَرد

ایک لڑکی کا جوڑا لگانے وقت مرد ایسا تلاش کرنا چاہیئے، جس میں کسب معیشت کی صلاحیت ہو، کچھ علم و ہُنر بھی رکھتا ہو۔ بعض نوجوان کرتے دھرتے کچھ نہیں، صرف بیوی پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی خانہ داری سنبھالنے کی صلاحیت خود نہیں رکھتے اور سارا الزام عورت پر رکھتے ہیں۔ چار پیسہ کمانے دینے پر، پیسہ پیسہ کا حساب بیوی سے لیتے ہیں اور اس کو خانہ داری پورا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خود کھانا نصیب نہ ہو۔ لیکن میاں صاحب سگریٹ پر سگریٹ جلاتے جا رہے ہیں۔ اپنی وضعداری کے لئے سب کچھ۔ بال بچہ کے لئے کچھ نہیں۔ اِدھر بیٹھے، اُدھر ٹہلے اور شام کو تشریف لائے کہ کوئی کام نہیں ملا۔

میں نے نوجوانوں کو دیکھا ہے، جو کما کے لائے، اس کا نصف سے زیادہ اپنی ذات پر خرچ کر ڈالا اور بقیہ میں سارے گھر والے، ماں باپ بھائی

بہن سب خرچ بیوی کے سر۔ بعض پڑھے لکھے صاحبزادے تو زیادہ تر اپنے بناؤ سنگار میں لگے رہتے ہیں۔ عورتوں سے زیادہ ان کی سجاوٹ ہوتی ہے۔ دولتمند اور ڈگری یافتہ جنٹلمین کو دیکھا کہ ساری دولت دعوت، کھیل تماشہ سیر و تفریح میں صرف ہوتی ہے اور اہل و عیال کی فکر نہیں۔ دِلّی میں کوئی جلسہ ہے، تو آپ کی موجودگی لازمی ہے۔ لکھنؤ میں کوئی کانفرنس ہے۔ وہاں جانا ضروری۔ بہتر سے بہتر سوٹ، اعلیٰ سے اعلیٰ ٹی سیٹ، نفیس سے نفیس کار آپ کے پاس۔ ہر سال خود سے معیشت کا ایک حصّہ علیحدہ کیا تو بقائے وصول ہوئے۔

صاحبزادے ہیں تعلیم یافتہ۔ ملازمت کا کیا کہنا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ جاتے ہی کچھ رشوت لی کچھ ڈینگ ڈانگ کی لڑائی جھگڑا کیا۔ گھر واپس آنے پر فرمانے لگے، کمبخت کانگریسی ہندو بہت ہی بدذہن ہیں کسی مسلمان کو پنپنے ہی نہیں دیتے۔ اب کے پاکستان جاؤں گا، وہاں کوئی بڑا عہدہ حاصل ہی کر کے رہوں گا۔ دو چار سو روپے کا سامان کیا۔ دو چار ماہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی سیر کی۔ صحیح سالم واپس آئے کہنے لگے لوگوں کو تمیز ہی نہیں، لائق آدمی کی پہچان نہیں۔ اَدُوے خَدُوے کو بھر دیتے ہیں اور صاحب صلاحیت کو چھانٹ دیتے ہیں۔ دنیا بدتمیزوں کی ہے۔ اب لا کی پریکٹس کروں گا۔ یہ بھی کر دیکھا۔ جو موکل ایک دفعہ آتا ہے

پھر دوسرے دن کان پکڑتا ہے۔ وکیل صاحب تو بات بات پر بگڑ جاتے ہیں، جھڑکنے لگتے ہیں۔ حاکم الگ ناکارے، کوئی درخواست منظور ہی نہیں کرتے۔ آج اس کے اجلاس پر جانے سے قسم کھائی۔ کل ان کے اجلاس پر۔ گھر آئے، بیوی پر اُلجھ پڑے۔ میں تجھے گھر سے نکال دوں گا۔ نہ ناشتہ کا خیال نہ چائے کا۔ ایم۔اے۔ بی۔ایل ہونے پر یہ نتیجہ گھر میں، کوئی قدر ہی نہیں۔ بیوی نے دبے منہ سے کہا، پیسے کہاں تھے۔ اور جو وہ ایک روپیہ دیکر گیا تھا؟ جواب ملا، بچے کی دوا منگائی ہے۔ دیکھئے اس کا کیا حال ہے۔ جائے مرے کمبخت۔ میں جاتا ہوں کسی دوست کے ہاں کھالوں گا۔ یہ ہے مزاج اور یہ دانشمندی۔

یہ تو معمولی سا خاکہ ہے۔ اس سے زیادہ بری حالت ہو رہی ہے اس زمانہ کے نوجوانوں کا مزاج دیکھ کر، یہ نازک مخلوق ان کے حوالے کی جائے، ورنہ شرافت کی زنجیر ایسی زبردست ہے کہ زندگی تلخیوں میں گذارنی پڑے گی۔ طور طریقہ گھر کا، سلیقہ، ماں باپ، بھائی بہن کے احوال سے واقفیت حاصل کرکے بے زبان لڑکی ان کے سپرد کی جائے۔

مرد کے مزاج کو اپنے موافق بنانے میں لڑکیوں کی دانشمندی اور ہوشیاری کو بھی دخل ہے۔ لڑکی اگر سمجھ دار ہے، تو اپنے شوہر کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ اس کی مزاج دانی، اس کی دلجوئی، اس کے آرام اور اس کی

خوشنودی کا خیال رکھنا عورت کا کام ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں کی پرداخت ایسی کریں کہ وہ ایک پُرامن، پُرسکون اور خوشگوار خانہ داری چلا سکیں۔ لڑکا ہو یا لڑکی، اس کی شائستگی یا ناشائستگی کی ذمہ داری ماں باپ پر ہے۔ ماں باپ، لڑکوں کو پڑھانے لکھانے میں وقت صرف کرتے ہیں اور کھلانے پلانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کے طور طریقے، عادات اور سلیقہ سکھانے کی طرف کم متوجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے میں اگلی فصل میں تربیت اولاد کے طریقے بیان کروں گا۔ لیکن قبل اس کے شادی بیاہ کے بعض حالات پر بھی روشنی ڈالنی ضرور ہے۔

پرورش اور پرداخت سے کہیں زیادہ بیاہ کا مسئلہ مشکل ہو گیا ہے۔ اور خاص کر لڑکیوں کی شادیاں۔ اگر جلد اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی، تو عرب کے ایام جاہلیت کی طرح ہمارے ہاں بھی لڑکی کا پیدا ہونا نحس سمجھا جانے لگے گا۔ اور بالآخر ان کو زندہ گاڑ دینا ہوگا۔ اسلامی دستور کے رُو سے یا عرب کے موجودہ رواج کی بنا پر تو لڑکی کی شادی میں کوئی خرچ ہی نہیں لڑکے کی شادی پر زیادہ خرچ ہے، یا جو خرچ ہے وہ لڑکے کی شادی پر کیونکہ لڑکے کو دین مہر ادا کرنا لازمی ہے اور علاوہ اس کے ولیمہ بھی مسنون ہے۔ لڑکی کے گھر بارات کا کھانا معیوب سمجھا جاتا ہے اور لڑکی والے سے تحفہ تحائف بھی لینا ایک امر ذلیل تصور ہوتا ہے جس طرح ہندوستان

میں لڑکی والا لڑکے کے گھر کھانا معیوب سمجھتا ہے، اسی طرح عرب میں اور اسلامی معاشرت میں لڑکی کے گھر کھانا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ شریعت کے رُو سے لڑکے کے گھر یا لڑکی کے یہاں آنا جانا، کھانا پینا، جائز ہے۔ فرق یہ ہے کہ لڑکے کی ملک پر ماں باپ کا حق ہو سکتا ہے، مگر لڑکی کے مال پر حق نہیں۔ کیونکہ اس گھر کا اصل مالک داماد ہے۔

مشرقی بنگال میں مسلمانوں کے ہاں یہ بھی دستور ہے کہ وہ لڑکی یا داماد کو کچھ نہیں دیتے ہیں اور لڑکا بھی سسر سے کچھ لینا عیب سمجھتا ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ ایک شادی بہار میں انجام پائی، لیکن لوگ تھے بنگال کے۔ سسر نے داماد کو ایک گھڑی دینی چاہی۔ داماد راضی نہ ہوا، جب بہار کے لوگوں نے بہت اصرار کیا کہ یہاں کا دستور ہے۔ داماد کو کچھ نہ دینا یہاں بُرا سمجھا جائے گا، تو اسے بالاکراہ قبول کیا۔ برخلاف اس کے میں نے دیکھا ہے کہ علاوہ نقدی اور جنسی تحائف کے گھڑی کم قیمتی ملی، اسی لئے داماد سسرال سے بغیر رخصتی کے واپس ہو جانے پر آمادہ ہو گیا، جب یقین دلایا گیا کہ یہ نئی کمپنی کی گھڑی ہے اور قیمتی ہے۔ اس کا بیجک دکھایا گیا، تو کچھ تشفی ہوئی۔ اکثر پہلے ہی عہد و معاہدہ ہو جاتا ہے کہ دس ہزار لیں گے، یا بیس ہزار، ورنہ شادی نہ کریں گے۔ افسوس ہے کہ اب ہنود تو تلک کو روک رہے ہیں اور ان میں

یہ رسم کم ہو رہی ہے، لیکن مسلمانوں میں یہ عیب داخل ہو گیا ہے جس کی وجہ سے شریف لڑکیوں کا جوڑا ملنا دشوار ہو گیا ہے۔

لڑکے اور لڑکے کے ماں باپ فخر کرتے ہیں کہ لڑکا ہمارا اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ ہے، روپے کیوں نہ لیں گے۔ لیکن اس کے اصلی پہلو کی طرف توجہ نہیں کرتے کہ بہر حال لڑکا بکتا ہے۔ اچھا لڑکا ہے، اس کی قیمت زیادہ ملتی ہے۔ مگر خریدار کون ہوتی ہے، اس کی بیوی۔ شوہر کیا ہوئے کہ بیوی کے زرِ خرید غلام ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ بیوی ان کے رعب داب میں نہیں رہتی۔ وہ تو سمجھتی ہے کہ یہ ہمارے خریدے ہوئے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں لڑکی خریدی جاتی تھی۔ یعنی اس جنس لطیف کی قیمت لگائی جاتی ہے۔ اسلئے کہ مرد عورت پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ وہ اس کے حکم کی تابع رہتی ہے۔ فقہ کی کتابوں میں عقدِ نکاح کو بیع رقبہ کی قسم میں داخل کیا ہے کسی کی ذات کو خریدنا، جیسے بعض ممالک میں لونڈی غلام بیچے یا خریدے جاتے ہیں۔ یہ میرا منشا نعوذ باللہ نہیں کہ دین مہر کو لڑکی کی قیمت قرار دوں، یہ تو نذرانہ ہے، جو اُن کی بڑائی دکھاتا ہے

چاہیئے کہ پڑھے لکھے نوجوان اس رسمِ بد کی طرف توجہ کریں اور اس کو اپنی جماعت سے نکالیں۔ یہ بڑی اصلاح ہوگی اور عورتوں کی یہ شکایت کہ مرد ہمیں ایسا ذلیل سمجھتے ہیں کہ ہم سے پیسہ لئے بغیر شادی نہیں کرتے،

رفع ہوگی اور بروز قیامت شارع اسلام کے آگے بھی سرخرو ہوں گے۔
ہر نوجوان کو سمجھنا چاہیئے کہ ایک دن وہ آنے والا ہے، جب خود اس کو اپنی لڑکی بیاہنی ہوگی اور کہا نہیں جا سکتا کہ اس وقت اس کی مالی حالت کیا ہوگی۔

خدائے پاک نے میرے ساتھ نہایت توازن کی صورت پیدا کر دی ہے۔ چار لڑکے ہیں اور چار لڑکیاں، اِدھر دینا، اُدھر لینا، یا نہ دینا، نہ لینا۔ میرے لئے مسئلہ برابر ہے۔ لیکن میں تو ان کو دیکھ کر مضطرب ہوں کہ جن کو لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں اور معاشی حالت نہایت کمزور، مگر ہیں شریف، فکر سے گھٹے جاتے ہیں۔ نہ ماں کو نیند، نہ باپ کو چین۔

اولاد

اولاد کو تین مرحلوں سے گذرنا ہے۔ بچپن، طفلی، بلوغ۔ تینوں کے حالات مختلف ہیں۔ اس لئے میں تینوں کو الگ الگ بیان کروں گا۔
بچپن۔ سب سے پہلے مرحلہ رضاعت۔ اکثر عورتوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ برابر گود میں لگائے رہتی ہیں اور بچہ اکثر دودھ کھینچتا رہتا ہے۔ اس میں دو نقصان ہے ایک تو یہ کہ بچہ کا معدہ خراب ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ غذا کی عادت بگڑ جاتی ہے۔ اس لئے ابتدا ہی سے ایسا دستور رکھا گیا ہے کہ جب بچہ بہت بھوکا ہو تب ہی دودھ پلایا جائے، ورنہ پالنے پر کھٹولے پر یا چٹائی پر لٹا دیا جائے۔ لیکن انسان کا فطری رجحان شغل کی طرف ہے، کچھ دیدیا جائے کہ چوستا ہے اور جب تک خود سے حرکت کرنے کی صلاحیت نہ ہو، سامنے کوئی ایسی چیز رکھ دی جائے، جو حرکت کرتی ہے تاکہ بچہ اس کو دیکھتا ہے۔ حرکت سے اس کی نگاہ اس کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ یا اس کے پالنے کو حرکت دیدی جائے، کچھ دیر ہو جائے، تو ماں یا اور

کوئی آکر اس سے کچھ بول جائے۔ اس طرح ماں کو سکون رہے گا اور بچّہ بھی ابتدا سے آزاد رہنے کا عادی ہو جائے گا۔ مگر اس امر کا خیال رکھنا ضرور ہے کہ بچّوں کو زیادہ رونے کا عادی نہ بنا دیا جائے اور وہ یوں ہوتا ہے کہ ماں اس کو چھوڑ کر گھر کے کام کاج میں لگ جاتی ہے اور اس کے بہلاؤ کا کوئی سامان نہیں رہتا، وہ پڑا پڑا روتا رہتا ہے۔ اس سے مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے اور اس کا اثر ساری زندگی مزاج پر رہتا ہے۔ اور دل بھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رو پڑتا ہے۔ میں نے ایک بی اے کے طالب علم کو دیکھا کہ ذرا سی بات پر رو پڑا، کئی گھنٹوں ہچکیاں لیتا رہا۔ حالانکہ نہ یتیم تھا اور نہ غریب۔

لازم ہے کہ بچپن میں پیشاب کی بھی ایسی عادت لگائی جائے کہ علی الصباح حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرنے کو بیدار ہو جایا کرے۔ بچّے عموماً سویرے ہی اٹھتے ہیں۔ لیکن اپنے تکاسلی سے ماں ان کو ٹھوک ٹھوک کر سُلا دیتی ہے جس کی وجہ سے دیر تک سونے کی عادت لگ جاتی ہے۔ ورنہ بچّوں کو پرندوں کی طرح علی الصباح اٹھ جانے کی عادت بہ تقاضائے فطرت ہوتی ہے۔ ان دنوں میں دیکھتا ہوں کہ عموماً نوجوان بہت دیر کر کے اٹھتے ہیں۔ اس طرح اپنی زندگی کا زیادہ مفید حصّہ سو کر گزار دیتے ہیں۔ لہٰذا بچپن سے بچّوں کو سویرے جگانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

اگر دودھ پلانے والی دائی رکھی جائے، تو حتی الوسع شریف النفس اور شریف النسب رکھی جائے۔ کیونکہ دودھ کا اثر بچّے کی طبیعت پر ہوتا ہے۔ بچّوں کا مزاج، ماں باپ کے مزاج کے موافق ہوتا ہے، اگر بدلتا ہے، تو صحبت کے اثر سے، جذبات خون سے پیدا ہوتے ہیں۔ خون میں اگر گندہ مزاجی شامل ہے، تو بچّوں میں گندگی اور دنائت پیدا ہو جائے گی۔ علاوہ اس کے دایوں کے اطوار اور طرز تکلّم اور رہائش کا اثر بھی بچّوں پر پڑتا ہے۔ بدزبان اور بدمزاج دایوں کے کلام اور گفتگو کا اثر بچّوں پر پڑتا ہے۔ بچّے اسی سے بولنا سیکھتے ہیں، جس کی گود میں رہتے ہیں۔ فطرت نے ان میں نقل کرنے کی صلاحیت دی ہے۔ اس لئے یہ نقل کرتے کرتے بولنے لگتے ہیں۔ پہلے کوشش کرتے ہیں۔ جب کوئی الفاظ صحیح نہیں بنتے اس لئے غاں غوں ہو کر رہ جاتا ہے۔ بتدریج آواز بننے لگتی ہے جب لفظ کا آسانی سے تلفّظ ہو سکتا ہے، وہ پہلے بولتے ہیں، جیسے ابّا۔ امّاں۔ دادا۔ نانا وغیرہ۔ اس لئے ماں کو چاہیئے کہ اکثر بچّے سے بولتی رہے اور ایک ایک لفظ کو کئی کئی بار بولتے جانا چاہیئے۔ تاکہ اس کو غور کر کے نقل کریں۔

عرب کا دستور تھا کہ بچّوں کو شہر سے باہر دیہاتوں میں رضاعت کے لئے بھیج دیتے تھے۔ کیونکہ شہر کی زبان مخلوط ہوتی رہتی ہے۔ دیہاتوں کی زبان خالص اور بامحاورہ رہتی ہے۔ اسی غرض سے حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو

بھی حلیمہ سعدیہ کے حوالہ کر دیا گیا تھا اور شاہانِ ایران کا یہ دستور تھا کہ جب عالمِ طفولیت کو پہنچے، تب ان کو عرب کے کسی دیہات میں یا ایران ہی کے کسی دور دراز مقام میں بھیج دیتے تھے۔ تاکہ کمسنی سے ان میں شاہانہ کروفر اور ناز و نعم کا اثر نہ پیدا ہو جائے۔ یہ بات جو ہندوستان میں بھی مشہور ہے کہ گھر پر پڑھنا نہیں ہوتا، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ گھر پر بچے آرام اور عافیت کے عادی ہو جاتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ آرام کے سامان مہیا ہوتے ہوئے بھی ماں باپ بچوں کو ان سے محروم رکھیں! اس لئے انہیں تکلیف برداشت کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ بہتر ہے کہ تھوڑا شعور آتے ہی لڑکوں کو گھر سے دور بھیج دیا جائے۔ لیکن ایسی ماحول میں رکھا جائے، جہاں اپنا ماحول ہو اور تربیت کا اچھا سامان ہو، کوئی حسب خواہ اتالیق مل جائے تو اس کو سپرد کر دیا جائے۔

بچے جب بولنے اور پھرنے لگیں، تو ان کو کمینوں کی صحبت سے بچایا جائے اگر کبھی گالی کے الفاظ سیکھیں، تو ان کو اس سے نفرت دلائی جائے۔ بچوں کو ڈانٹ کر کبھی نہ کہا جائے۔ سمجھانے کے نتیجے میں ناپسند چیزوں کی برائی بتائی جائے اور نفرت دکھائی جائے۔ ان کو خود باتوں کو غور کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ڈانٹ اور جھڑپ کی باتیں بچوں پر کم اثر کرتی ہے۔ کیونکہ وہ تیور اور انداز ایسا ہوتا ہے کہ فطرت اس سے نفرت ہوتی ہے اور جس چیز سے

نفرت ہوتی ہے، انسان اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا ہے بلکہ مخالفت کرنے کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ جن لڑکوں کو زیادہ فراست ہوتی ہے، وہ زیادہ ضدی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے جو نصیحت کی جائے، نرمی اور محبت کے انداز سے کی جائے، تاکہ بچے کا دل اس کی طرف مائل ہو۔

بچوں کی ہر خواہش کی مخالفت نہ کی جائے۔ بلکہ جن باتوں میں زیادہ نقصان نہ ہو، اس میں موافقت کرے۔ بلکہ بعض کھیلوں میں شرکت کر کے کھیلائے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ الگ جا کر دوسروں کے ساتھ کھیلنے کا عادی ہو جائے۔ گھر میں بچوں کے کھیلنے کا سامان مہیا کر دینا چاہیئے۔ تاکہ دوسرے بچوں سے ملنے پر مجبور نہ ہو اور کھیلتے وقت کبھی پڑھنے لکھنے کا ذکر نہ کرے کھیلنے کے وقت کھیلنے دے اور جب کھیل کر آسودہ ہو جائے، تب پڑھنے میں لگایا جائے۔ اور پڑھنے لکھنے کو ایک مصیبت نہ بنا دیا جائے، بلکہ ایسا ہو کہ اور کھیلوں کے ساتھ پڑھنا لکھنا بھی کھیل سمجھنے لگے اور اس کی دلبستگی ہونے لگے۔ جو لوگ کمسن بچے پر پڑھنے کی زیادہ تاکید کرتے ہیں وہ بالآخر ذکر نوشت و خواند سے منحرف بنا دیتے ہیں۔

لذیذ کھانے اور نفیس لباس کا عادی نہ بنایا جائے۔ مگر جب لذیذ غذا اور نفیس لباس کے عادی ہو جاتے ہیں، تو اکثر ضروریات زندگی سے بے پروائی برتتے ہیں۔ اپنی آمدنی کا زیادہ حصہ کھانے اور پہننے میں صرف

کردیتے ہیں۔ اور بعض گھروں میں ایسا ہوتا ہے کہ صاحب خانہ کے لئے دوسرا دسترخوان آراستہ کیا جاتا ہے اور دوسروں کے لئے معمولی غذا ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ گھروالے صاحب خانہ سے متنفر ہو جاتے ہیں اور جب خود صاحب اختیار ہو جاتے تو باپ سے اس کا بدلہ لیتے ہیں، خود کھاتے کھلاتے اور باپ ماں کی طرف سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔

لازمی ہے کہ لڑکا جب پڑھنے کے لائق ہو تو قرآن مجید سب سے پہلے پڑھایا جائے اور اس کے بعد دینیات کی کتابیں اچھی طرح پڑھائی جائیں کیونکہ بہت ممکن ہے کہ پھر دینیات کی طرف موقع نہ ملے۔ اس لئے فنون رائج کی طرف لگانے سے پہلے مسائل دینیہ سے لگاؤ کر دینا لازم ہے اور بچیوں کو دینیات کے بعد امور خانہ داری کی مہارت دلائیں۔ اور صنعت ضروریہ سکھلادیں۔ تاکہ اپنی خانہ داری میں دقت نہ واقع ہو۔ لڑکیوں کو انتظام غذا اور پرورش اولاد کے متعلق تمام امور سے واقفیت ہونی چاہیئے۔ بلکہ بعض امراض جو اکثر بچوں کو لاحق ہوتے ہیں، ان کا علاج بھی معلوم ہونا چاہیئے۔ میں نے دیکھا ہے اگلے زمانہ میں عورتیں ادویہ ضروریہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتی تھیں۔ اور اس میں جو چیز کم ہو جاتی فوراً پورا کرنے کی فکرمند ہو جاتیں۔ یہ ضرورت نہ ہوتی کہ بچہ زیادہ رو رہا ہے تو فوراً ڈاکٹر صاحب کو بلا دیا گیا۔ بچوں کو بھی ٹھنڈی ہوا لگی، رونے لگے

سوءہضمی ہو گئی، بیچین ہو گئے۔ چلنے پھرنے میں ٹھیس لگی، چیخ پڑے۔ ہر وقت کہاں تک ڈاکٹر آتا رہے گا۔ بچہ کش عورتوں کو چاہیئے کہ فوری علاج خود کرلیں۔ اندنوں ہر گھر میں پڑھا لکھا آدمی ٹنکچر آیوڈین، کرسچین سالٹ اور ہیلنگ بام ضرور اپنے پاس رکھتا ہے۔ بہتر ہے بچیوں کو فیملی گائڈ کا ماہر بنادیا جائے۔

معلم کے انتخاب کے وقت اس کے علم و دانش سے زیادہ اخلاق و اطوار پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ استاد کے اخلاق کا متعلم پر بہت اثر پڑتا ہے۔ بہتر ہے کوئی دیندار مہذب، شائستہ اور صحبت یافتہ معلم کو بڑے لڑکوں کو نگراں بنایا جائے اندنوں کالج اور اسکول کے داخلہ کے بعد اس ادارہ پر بھروسہ کر کے چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے داخلہ کے قبل ادارہ کی حالت سے پوری واقفیت حاصل کرنی چاہیئے۔ اسلامی ادارہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ کم از کم ہر ضلع میں ایک ایسا ہائی اسکول ہو، جس کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور ہر صوبہ میں ایک کالج ایسا ہونا چاہیئے، جس میں مسلمانوں کا دخل زیادہ ہو اور ایسے ادارے قومی فنڈ سے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ حکومت کے لئے یہ بہت مشکل ہے کہ مختلف مذہب اور کلچر کے لحاظ سے مختلف ادارے قائم کرے، یا ہر ادارے میں ہر مذہب کا خیال رکھا جائے۔ مسلمانوں کا کلچر چونکہ جداگانہ ہے۔ اس لئے ان کو تعلیم گاہیں علیحدہ بنائی جائیں۔

لڑکوں کی تعلیم کے لئے لازم ہے کہ ان کی فطری میلان کا علم حاصل کیا جائے۔ آجکل تو نفسیاتی تجربات آسان ہیں۔ بچوں کی جانچ کیا جائے۔ اس کے بعد حسب میلان طبع اس کے علوم وفنون کی طرف مائل کیا جائے، تاکہ اس میں کمال حاصل کرسکیں۔ دیکھا گیا ہے کہ خلاف طبع کسی فن میں لگا دیا گیا تو لڑکے کا وقت ضائع گیا۔ اس میں کمال حاصل نہ کرسکے۔ ایک کو چھوڑ کر دوسرے کسی طرف لگائے، وہ موافق طبع نہ ہوگا، تو ساری زندگی خراب ہوجاتی ہے۔ جس فن میں لگایا جائے، اس کے کمال تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔

اب یہ زمانہ نہیں کہ ایک آدمی تمام فنون کا عالم ہو، اب زمانہ اس کا ہے کہ ایک آدمی ایک سے زیادہ فن میں کمال حاصل نہیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ علوم وفنون میں بہت وسعت ہوگئی ہے، نئی نئی انکشافات ہوتی رہتی ہیں۔ ایسا وقت نہیں آیا ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ تکمیل ہوگئی۔ اس لئے ایک فن میں زندگی بھر لگا رہے جب ہی امید ہے کہ زندگی کامیاب ہو۔

جتنک بچے کسی فن میں کمال حاصل نہ کرلیں، اس پر خانہ داری کی ذمہ داری عائد نہ کی جائے۔ کیونکہ ایسی حالت میں لڑکے پریشان ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ماں باپ سات سات لڑکوں کی شادی کرتے بہنوں اور ان کی اولاد کی پرورش ایک حد تک کرلیتے تھے۔ لیکن اب رہائش اس قدر ترقی پذیر ہوگئی ہے کہ اندنوں ناممکن ہوگیا ہے کہ

لڑکوں کی شادی ہوجائے اور ادھر ناقابل برداشت تفکرات کا بوجھ نہ پڑجائے شادی ایسی حالت میں کی جائے کہ لڑکے اور لڑکی دونوں اس قابل ہوں کہ اپنا گھر سنبھال لیں۔ بلکہ ماں باپ کو سبکدوش کردیں، ان کی ضروریات کی بھی کفالت کرسکیں۔

یوروپ والے اس امر کے لئے ممتاز ہیں کہ تعلیم کے علاوہ وہ نوجوانوں کی تربیت نہایت اچھی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر سڑک پر چند نوجوان ٹہل رہے ہوں تو بتادیا جاسکتا ہے کہ ان میں کون یوروپ کا تعلیم یافتہ ہے۔ مجلس میں بیٹھے ہوں تو بھی نمایاں ہوں گے۔ گفتگو کرتے ہوں گے تو بخوبی ظاہر ہو جائے گا کہ یہ یوروپ کا تعلیم یافتہ ہے۔

جو چلتا ہوگا، اس کے قدم مساوی اور ایک سیدھ میں ہوں گے ہندوستانی گریجویٹ کا ایک قدم چودہ انچ کا تو دوسرا سات انچ کا ہوگا۔ کبھی داہنے دبتا ہوا اور کبھی بائیں اور یوروپ کے تعلیم یافتہ کا قدم مساوی ہوگا جس کو وہ کہتے ہیں (MEASURED STEPS) (ناپے ہوئے قدم) اُستاد ان کو ساتھ لے کر ٹہلتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح قدم اٹھانا چاہیئے اور نگاہوں کو کدھر رکھنا چاہیئے۔ ہندوستانی نوجوان کبھی داہنے طرف دیکھیں گے اور کبھی بائیں اور کبھی اوپر کے جھروکے پر نظر ہوگی۔ لیکن یوروپ کا تعلیم یافتہ ہمیشہ اپنی نگاہ چلتے وقت سامنے رکھے گا اور وہ بھی دس بیس قدم سے

سے زیادہ دور نہ دیکھے گا۔ متوجہ کرانے پر داہنے یا بائیں دیکھے گا۔ کسی مجلس میں اس طرح کبھی نہ بیٹھے گا کہ دوسرے کو نفرت ہو۔ یا کسی دوسرے کی تذلیل ہو۔ اپنی مخصوص سیٹ پر اس انداز سے بیٹھے گا، جس انداز سے بیٹھنے کیلئے وہ سیٹ بنائی گئی ہے۔ میں ایک جگہ گیا۔ چند آدمی پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی بیٹھ گیا، ایک صاحب جو میرے بغل میں تھے انہوں نے اپنی دونوں ٹانگیں کرسی کے دستے پر اٹھا کر ڈال دیں اور جوتے کا مکروہ اور گندہ تلا میرے منہ کی طرف گھنٹوں لٹکتا رہا

میں تقریباً اس کے باپ کے سن کا تھا۔ جب اثنائے گفتگو میں کسی نے مجھے پروفیسر صاحب کہکر مخاطب کیا، تو اس نے اپنی ٹانگیں سمیٹیں اور فرمانے لگے معاف فرمایئے گا۔ میں نے نہیں پہچانا۔ میں نے عرض کیا کہ آپ آرام سے تشریف رکھیں۔ تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی ہو، کسی رتبہ کا ہو ہمیں اپنی گفتگو اور اپنی نشست سے اس کی تذلیل نہیں کرنا چاہیئے۔

ایک نہایت تعلیم یافتہ نوجوان کو جس کا علم اور جس کی دانست لائق تعریف تھی، اپنے ایک بزرگ سے یوں گفتگو کرتے سُنا۔ بزرگ نے فرمایا کہ ہاں وہ صاحب جو آئے تھے، وہ میرے بڑے دوست تھے۔ کوئی دن نہیں ہوتا کہ میں ان سے نہ ملتا، کبھی میں نہ جاتا، تو وہ دوڑے آتے ان کو مجھ سے بڑی محبت ہے، عالم ہیں اور حافظ بھی۔ علاوہ اس کے اچھے

طبیب ہیں۔ صاحبزادے نے فرمایا کہ وہ تو نہایت پاگل سے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آنے کے ساتھ ہی اوجھٹ کی سی گفتگو شروع کردیں۔ غور فرمائیں بزرگ ان کو دوست اور صاحب علم بنانا چاہتے ہیں اور آپ اس کے دوست کو پاگل اور اُجھٹ فرما رہے ہیں۔ یوں کہیئے کہ بہت تند مزاج معلوم ہوتے ہیں، گفتگو بہت گرم کرنے لگے یوں بادی النظر میں بدنما نہ معلوم ہوتا؟

میں پہلے گفتگو کے اصول درج کروں گا۔ پھر نشست و برخواست اور حرکت و سکون، نیز آداب طعام وغیرہ۔

آداب سخن :۔ کلام کی اصل غرض دو ہے۔ کسی چیز کی خبر دینا، یا کوئی شئے مانگنا۔ جس کلام میں خبر و طلب میں سے کوئی ایک مقصود نہ ہو، اسے مہمل کہتے ہیں۔ اس لئے گفتگو کی ابتدا کرنے کے قبل ایک سمجھدار آدمی کو موضوع گفتگو قائم کر لینا چاہیئے۔ اس کے ساتھ کلام مجموعہ ہے۔ الفاظ کا۔ اس لئے لفظ مناسب منتخب کر لینا تقاضہ عقل ہے۔ یہ ضرورت نہیں کہ ہر بات بولنے کے قبل انسان کچھ دیر ٹھہر کر موضوع اور الفاظ کی سوچ میں پڑ جائے۔ بلکہ ایسی مہارت کی جائے کہ بوقت ضرورت مناسب کلام اور موافق الفاظ آتے رہیں۔ جیسے ایک ٹائپسٹ ٹائپ کرنے کے وقت حروف کی تلاش نہیں کرتا، بلکہ بغیر کسی تشویش اور تامّل کے اُنگلی مناسب حرف پر پڑتی جاتی ہے۔ لیکن مہارت پیدا کرنے کے لئے، کمسنی ہی سے

عادت لگائی ہوگی اور ماں باپ یا استاد کو لازم ہے کہ لڑکا جب خلاف موضوع گفتگو شروع کرے، تو اس کو روک دے۔ الفاظ اگر نامناسب منہ سے نکل پڑیں تو روک دے۔ ایک دن میں دسترخوان پر تھا۔ بڑے بھائی صاحب تھے اور حکیم عبداللطیف صاحب مرحوم رشتہ میں جو میرے بھائی ہوتے تھے موجود تھے۔ میں تقریباً بارہ برس کا تھا۔ ملازم نے کوئی غلطی کی۔ میں نے غصہ میں گالی کا ایک لفظ استعمال کیا، جس کو میں اس وقت نہیں سمجھا تھا کہ بہت برا ہے۔ حکیم صاحب مرحوم نے میری طرف نگاہِ گرم کرکے دیکھا اور کہا یہ کیا لفظ بول گئے، شریف لوگ ایسے مکروہ الفاظ نہیں بولتے۔ اس دن سے آج تک میں نے وہ لفظ کبھی استعمال نہیں کیا۔ لیکن دیکھتا ہوں لوگ اکثر ایسے مکروہ الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں ٹوکتا ہے۔

مجمع کی حیثیت اور سننے والوں کی لیاقت کا اندازہ کرکے گفتگو کرنا چاہیئے۔ زیادہ بولنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیئے۔ ایک حکیم سے پوچھا گیا کہ آپ سنتے رہتے ہیں، بولتے کم ہیں۔ جواب دیا کہ قدرت نے دو کان دیئے ہیں اور ایک زبان، اس کا مطلب یہ ہے کہ دو سنے تو ایک بولے۔ کلام میں حتی الوسع سبقت نہیں کرنا چاہیئے اور کوئی شخص کچھ بول رہا ہو تو درمیان میں گفتگو اپنی نہیں چھیڑنا چاہیئے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کچھ

لوگ ایک طرف گفتگو کر رہے ہیں۔ کچھ دوسری طرف اس سے مجمع بے لطف ہوجاتا ہے۔ دعوت میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن کوئی موضوع کلام مقرر نہیں ہوتا۔ اس لئے فطرتاً ٹولیاں بن جاتی ہیں۔ صاحب خانہ کو چاہیئے کہ ایسے موقع کے لئے کوئی موضوع مقرر کرکے خود، یا کسی صاحب صلاحیت کو مجاز بنائے کہ وہ لوگوں کو متوجہ رکھے۔ اب تو پارٹیوں کا اچھا دستور ہوگیا ہے کہ مختلف ٹیبل الگ الگ سجے جاتے ہیں۔ اس لئے ہر ٹیبل پر الگ الگ گفتگو اپنے اپنے مذاق کے مطابق چھڑ جاتی ہے۔ مجمع میں انتشار نہیں ہوتا۔ دعوتوں میں نہ وقت سے پہلے جائے اور نہ بعد کو ٹھہرے اِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا (کھانا کھاچکو تو بکھر جاؤ)۔ یہ قرآن کی تعلیم ہے۔ لیکن آج کل بعض پارٹیوں میں کھانا پینا ختم ہونے پر کچھ لیکچر شروع ہوتے ہیں، جو ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر ٹھہر جانا چاہیئے۔

بڑوں کے سامنے نہ زیادہ بلند آواز سے گفتگو کی جائے کہ گستاخی معلوم ہو اور نہ اتنا آہستہ کہ سننے میں مجبوری ہو اور بار بار پوچھنا پڑے بڑوں سے گفتگو کرتے وقت ہاتھ پاؤں یا آنکھ اور بھنوں کو حرکت نہ دی جائے اور گفتگو کے وقت نظر اِدھر اُدھر نہ کی جائے۔ آج کل جو ہر ملازمت کے پہلے انٹرویو ہوتا ہے۔ اس کا اصل منشا یہی ہے کہ انداز گفتگو سے مزاج اور ذہانت کا پتہ لگایا جائے۔ اب تو ڈگریوں کے امتحان میں مکالمہ

ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، طریقۂ کلام کو اہمیت دی جا رہی ہے۔

کلام میں کسی سے اختلاف رائے ہو جائے، تو زیادہ اُلجھنا نہ چاہیئے مگر مخاطب اگر مائل نہ ہو تو اس پر اصرار نہ کیا جائے کہ وہ مان ہی لے۔ اصرار سے کوئی کسی کی رائے نہیں مانتا اور بالخصوص جب کسی کا مزاج ضدی واقع ہوتا ہے۔ وہ کسی طرح نہیں مانتا۔ اس لئے اندازہ دیکھ کر کلام مختصر کر دینا دانشمندی ہے۔

غلام اور ماتحت سے بھی جھڑک کر کوئی بات کہنی نہ چاہیئے۔ شائستگی کے خلاف ہے اور جھوٹ، غیبت، چغلخوری، افترا اور اتہام سے بچے، بلکہ ایسی مجلس سے جہاں ایسی باتیں ہوتی ہوں، بچنا چاہیئے۔ اگر کوئی دشمن کی بھی غیبت شروع کرے، بجائے اس میں دلچسپی لینے کے معذرت کر کے گفتگو بدلنا چاہیئے۔ کوئی اچھا ہے، تو اس کو بُرا کہنا بڑی نا انصافی ہے اور اگر واقعی بُرا ہے، تو غیبت میں بُرا کہنے سے کیا حاصل، وہ بُرائی چھوڑ نہیں سکتا۔ کسی کو بُرا جان کر خوش ہونا انسانی ہمدردی کے خلاف ہے۔

بات وہ کی جائے کہ دوسروں کو فائدہ ہو، یا دوسروں کی برائی رفع ہو یہ کوئی اچھی بات نہ ہوگی۔ ہماری گفتگو کی وجہ سے دوسرا اوروں کی نگاہ میں گر جائے۔ بلند خیال وہ ہے، جو دوسروں کو بلند کرنا چاہیئے۔ نہ کہ وہ جو

دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے۔

ایک دفعہ میں نے انگریزی زبان میں ایک مضمون لکھا تھا۔ میں نے وہ مسودہ ایک مخلص کو دکھایا، اس میں کچھ سخت الفاظ تھے۔ اس پر انہوں نے انگریزی میں فرمایا، جس کا مطلب یہ ہے کہ "سخت الفاظ کبھی ہڈی نہیں توڑتے"۔ مقصد یہ ہوا کہ سخت الفاظ استعمال کرنا لا حاصل ہے۔ سوا اس کے کہ مخاطب کے دل کو مجروح کیا جائے۔ حالانکہ دور اندیشی اور انسانیت کا تقاضہ ہے کہ جو مخالف ہو، اس کو موافق بنایا جائے۔

زبان انسان کو دشمن سے دوست بھی بنا سکتی ہے اور یہی زبان دوست کو دشمن بنا دیتی ہے۔ زبان کے زخم کا کوئی علاج نہیں۔ نہ اُن کا زخم مندمل ہوتا ہے:

جراحات الثنایا التیام ؛ ولا یلتام ما جرح اللسان
دانت کے زخم کا اندمال ہوتا ہے ؛ لیکن زبان کے زخم مندمل نہیں ہوتے

ماں باپ سے گفتگو کرتے وقت زیادہ احتیاط کی جائے۔ کیونکہ کلام پاک میں ہے کہ لَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا۔ اُن کو اُف تک نہ کہو اور نہ اُن کو جھڑکو۔ ایک مخلص سے مخلص دوست کے ساتھ بھی گفتگو کرتے وقت اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیئے، کہ کہیں کوئی لفظ، کوئی تیور خلاف مزاج نہ ہو۔ برسوں کی دوستی محض تیور اور چھوٹے چھوٹے لفظوں کے غلط استعمال

کی وجہ سے ٹوٹ جاتی ہے اور دلوں میں میل آ جاتا ہے۔ پھر زندگی بھر اس کا علاج مشکل ہو جاتا ہے۔

لڑکیوں، عورتوں، دیوانوں اور بدمستوں سے کلام کرنے میں احتراز کرے۔ اگر ضرورت کی بنا پر کچھ کرنا پڑے، تو بہت اختصار کرے، کیونکہ ان کے مزاج کا کوئی اعتبار نہیں۔ کس بات پر بدل جائے اور بے لطفی پیدا ہو جائے۔ کسی سے اس طرح گفتگو نہ کرے، جو وہ سمجھ نہ سکے۔ وحشت انگیز خبریں یا قصے حتی الوسع خود نہ کہے۔ اگر ضروری سمجھے کسی سے کہلا دے: ع

بلبلا مژدہ بہار بیار   خبر بد بہ بوم شوم گذار

اے بلبلِ خوشنوا بہار کی خبر تو لا۔ اور بد خبر ہو تو بدنصیب اُلو ہی پر چھوڑ۔

حاکم اور افسروں سے بھی گفتگو میں بہت اختصار کرے۔ کیونکہ لفظ کی گرفت ہوگی۔ جہاں تک کم کیا جائے بہتر ہے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ حاکم کو بہت خبریں ملیں گی، تو بہت خوش ہوگا۔ اولاً یہ کہ حاکم کی فطرت ثانیہ ہوتی ہے کہ اپنے ماتحت کی ہر بات پر امکانی کذب رکھتے ہیں۔ اگر دس میں سے دو چار کی تفتیش کی اور حقیقت دریافت نہ ہوئی تو شک رہ جائے گا۔ اور یہ شک نگاہ سے گرا دے گا۔ جن باتوں کی وہ خود تحقیق کر سکیں گے

اُنہی پر ان کو بھروسہ ہوگا۔ اور بقیہ مشکوک۔ کیونکہ عموماً ایسے ہی لوگ ملتے ہیں، جو ایک کی جگہ چار بکتے ہیں۔ اس لئے ان کا مزاج شکی بن جاتا ہے۔

بعض لڑکوں کو قسم کھانے کی عادت ہو جاتی ہے۔ ابتدا ہی سے ایسی عادت سے روکنا چاہیئے۔ خواہ سچی قسم ہو، خواہ جھوٹی۔ قسم کھانے والوں کو لوگ عموماً جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اندنوں دیکھتا ہوں بلا وجہ بھی اللہ اور خدا کی قسم کھنے کی عادت ہوتی ہے، حکماء کے نزدیک یہ ناروا ہے۔

حرکت و سکون کے آداب

چلتے وقت احتیاط رکھے کہ نہ زیادہ تیز چلے اور نہ بہت سست تیزی غصہ اور اضطراب کی علامت اور سست رفتاری کاسلی اور غم واندوہ کی علامت ہے۔ مغروروں کی طرح اکڑ کر بھی نہ چلے اور نہ چلتے وقت اِدھر اُدھر دیکھا کرے۔ عورت کی طرح جھوم جھوم کر نہ چلے جب چلے ایک سیدھ میں آگے کی طرف ایک انداز سے بڑھتا جائے، نہ یہ کہ کبھی لمبا قدم اُٹھائے اور کبھی چھوٹا۔ تیزی سے قدم نہ اٹھائے۔ اِدھر اُدھر دیکھنا، ہاتھ یا کاندھا ہلانا۔ داہنے بائیں چلتے مُڑ جانا حماقت کی علامت ہے۔ گردن کبھی اِدھر، کبھی اُدھر جھکنا نہ چاہیے۔ بار بار اُنگلیاں چٹخانا، یا بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیرنا، یا مونچھ اینٹھتے رہنا احمق کی علامت ہے، زیادہ ہنسنا یا زیادہ مسرت کا اظہار حزن وملال پیدا کرتا ہے۔

لوگوں کے سامنے ناک صاف کرنا، اِدھر اُدھر تھوکنا اور بے احتیاطی

کے ساتھ چھینکنا، تہذیب کے خلاف ہے۔ چھینک آئے تو رومال سے ناک اور منہ پر پردہ ڈال لے اور فوراً ناک، منہ صاف کرلے۔ جمائی آئے تو منہ پر ہاتھ رکھے۔ سب کے سامنے منہ پھاڑ پھاڑ کر جمائی لینا ناشائستگی ہے۔ اسلامی طریقہ یہ ہے کہ چھینک کے بعد "الحمدللہ" کہے اور سننے والا "یرحمک اللہ" کہے۔ پھر چھینک والا اس کی اس دعا کے جواب میں "جزاک اللہ" کہے۔ آستین اور دامن سے ناک مُنہ صاف نہ کرے۔ اس سے نزدیک والوں کو نفرت اور کراہیت ہوگی۔ کسی وجہ سے اگر مُنہ سے لعاب نکلے تو فوراً رومال سے صاف کرے۔

کسی محفل میں جائے تو اپنے مرتبہ کا اندازہ کرکے مناسب جگہ پر بیٹھے نہ سب سے اعلیٰ مقام پر بیٹھنے کی کوشش کرے اور نہ سب سے نیچے درجہ پر۔ کیونکہ اُونچے درجہ پر بیٹھنا خود پسندی اور غرور کی علامت ہے اور نیچے درجہ پر طبیعت کی دنائت اور پستی ظاہر ہوتی ہے۔ اعتدال بہرنوع بہتر ہے اور اگر کوئی باوقار شخص آجائے، تو خود سے اس کے لئے جگہ خالی کردے قبل اس کے کہ دوسرے لوگ کہیں کہ ذرا ہٹ جایئے، خود ہٹ جانے میں فراخدلی ہے اور دوسروں کے کہنے سے ہٹنے پر ذلت محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر اپنی جگہ خالی نہ پائے، تو بغیر کسی طرح کے اظہار کدورت کے واپس ہوجائے۔ کیونکہ شکایت کرنے سے اعزاز میں افزائش نہ ہوگی، بلکہ یہ

راز کہ اس کو جگہ نہ ملی پوشیدہ رہے گا، ذلت نہ ہوگی۔

کسی جلسہ یا محفل میں نہ وقت سے بہت قبل چلا جائے اور نہ اس قدر دیر کرے کہ کارروائی شروع ہو جائے۔ کہیں جانا ہو تو کافی وقت قبل سے تیاری کرے اور ضروری چیزوں کو دیکھ لے کہ وقت پر دقت نہ ہو۔ یہ نہیں کہ چلتے وقت بوٹ میں پالش ہو رہی ہے، یا پہنتے وقت دیکھا کہ کوٹ میں بٹن نہیں ہے اور سارے گھر میں ہنگامہ ہو رہا ہے۔ یہاں تک کہ محلہ والوں کو خبر ہو جائے کہ صاحب کے کوٹ میں بٹن نہیں۔ اسی طرح چائے ناشتہ وغیرہ سے ضروری کاموں سے پہلے ہی فارغ ہو جائے اور سواری کا انتظام کرے ایسا نہ ہو کہ کونووکیشن شروع ہو گیا اور فٹن والا گھوڑے کو پانی پلا رہا ہے۔ صاحب سوٹ پہن کر ٹہل رہے ہیں اور غصّہ میں چُور ہیں۔

اپنے روز کے کاموں میں بھی تکاسلی کبھی نہ برتیے۔ سونے، جاگنے کا وقت مقرر رکھیے، وقت پر سوئیے اور وقت پر جاگیے، وقت پر کھائیے اور اگر کسی وجہ سے وقت پر نہ ملے، تو صبر کرے۔ اس سے صحّت بھی اچھی رہتی ہے اور دنیا کے کاروبار بھی وقت پر انجام پا سکتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ایک کام کو جمع کرنے کی غرض سے رات بھر جاگ گئے اور صبح کے وقت اتنا سوئے کہ آفس پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ وہ شخص افسری نہیں کر سکتا، جو خود سے کام ٹھیک وقت پر انجام نہیں دے سکتا۔

صبح سویرے اٹھنے میں بہت مصلحتیں ہیں۔ میں نے ایک بات سمجھی ہے کہ صبح کو قبل طلوع آفتاب اُٹھنے والوں کی آنکھ کی روشنی جلد خراب نہ ہوگی۔ کیونکہ فطرت نے یہ انتظام کیا ہے کہ دن کی روشنی کو بتدریج زائل کرتی۔ روشنی کم ہوتے ہوئے تاریکی آتی ہے۔ اسی طرح صبح کی روشنی بھی بتدریج بڑھتی ہے۔ آنکھ پر زیادہ زور نہیں پڑتا۔ برخلاف ان لوگوں کے، جو دیر تک سوتے ہیں، جب اٹھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ ساری دنیا روشن ہے۔ آنکھ جلد کھلتی نہیں۔ کچھ دیر آہستہ آہستہ ملنے پر دِقت سے کھلتی ہے۔ کیونکہ آنکھ پر آفتاب کی چمک شاق گذرتی ہے اور رفتہ رفتہ آنکھ کمزور ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دنوں چشمہ کا رواج بہت بڑھ گیا ہے۔ کیونکہ آج کل سونے جاگنے کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ ہمارے بچپن میں زیادہ سونے کی بڑی ہنسی اُڑتی تھی اور طرح طرح کے مذاق ہوتے تھے۔

مجمع کے سامنے نیند آنے لگے، تو نیند کو ٹالنا چاہیئے۔ بیٹھے ہوئے لوگوں کے سامنے سو جانا تہذیب کے خلاف ہے۔ اور اگر بہت زیادہ مجبور ہو تو الگ جا کر سو رہے۔ لیکن کوشش کرے نیند میں خرخر کی آواز کم نکلے۔ دوسروں سے کہے کہ آواز نکلے، تو جگا دے۔ چند دفعہ ایسا کرنے سے آواز کم ہو جائے گی اور دیکھا گیا ہے کہ چت سونے

سے آواز زیادہ ہو جاتی ہے۔ اس لئے چت نہیں سونا چاہیئے۔ بہتر ہے کہ
داہنے پہلو سونے کی عادت کرے۔ مسنون ہے جب بستر پر جائے پہلے
داہنے پہلو لیٹے۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بائیں پہلو پر بھی لیٹ
رہے۔ پھر جب نیند آنے لگے، داہنے پہلو پر لیٹ جائے۔ مستحسن ہے کہ
اُتر سر کرے اور دکھن پاؤں اور داہنے پہلو سوئے۔ اس طرح سے رُخ
قبلہ کی طرف ہوگا۔ پچھم سر کرکے سونا بھی اچھا ہے۔ لیکن پچھم پاؤں کرکے
نہ سوئے۔ اس میں بے ادبی معلوم ہوتی ہے۔ اسی پر قیاس کرکے لوگ مردہ
بھی اس طرح نہیں رکھتے کہ پاؤں پچھم پڑتا ہو۔ حالانکہ مردہ کے لئے یہی
مسنون ہے۔ کیونکہ مردہ چت لٹایا جاتا ہے، قبلہ اس کے مُنہ کے سامنے
پڑے گا اور غالباً اسی مصلحت سے مدینہ طیبہ میں جتنی قبریں ہیں، وہ اُتر،
دکھن ہیں۔ یعنی سر اُتر اور پاؤں دکھن۔ مکہ معظمہ وہاں سے دکھن ہے۔
اس لئے سر اُتر رکھا کہ قبلہ رُخ کے سامنے رہے۔ ہم لوگ ہندوستان
میں قبر نبویؐ کی مشابہت رکھتے ہیں، اس لئے سر اُتر رکھتے ہیں۔ اور اب
تمام دنیائے اسلام میں یہی دستور ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سر ہاتھ یا زانوں پر رکھ کر نہ سوئے، اس سے افسردگی ظاہر ہوتی
ہے اور یہ عورتوں کا طریقہ ہے کہ سر ٹخنوں سے لگا کر جھکالیں۔ یہ علامت
حیا کی ہے۔ ان کے لئے نہایت شایان ہے۔ مردوں کو مناسب نہیں کہ

عورتوں کا طریقہ اختیار کریں۔ پاؤں پر پاؤں رکھ کر نہ لیٹیں یعنی اس طرح
کہ ایک پاؤں کے انگوٹھے پر دوسرے پاؤں کی ایڑی ہو۔ اگر ایک پاؤں
کی پھلّی دوسرے پاؤں کی پھلّی پر ہو تو بُرا ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ
وسلّم اس طرح پاؤں رکھ کر بیٹھتے تھے۔ کیونکہ اس طرح تہبند کے کھلنے کا
احتمال کم ہوتا ہے۔

کسی مکان یا کسی کے کمرے میں بلا اجازت ہرگز داخل نہ ہوں۔ مخلص
سے مخلص شخص کے کمرے میں بھی اس کی اجازت کے بغیر داخل نہ ہوں
کیونکہ آدمی اپنے کمرے میں بے تکلفانہ پڑا رہتا ہے۔ اس حال میں کسی دوسرے
کا آجانا بے موقع ہوتا ہے۔ عورتوں کے کمرے میں تو داخل ہونے کے قبل
زیادہ احتیاط ہونا چاہیئے۔ ماں یا بیٹی کے پاس بھی بے دھڑک نہ پہنچ
جائے۔ بلکہ اپنی بیوی کے نزدیک بھی یکایک پہنچ جانے کی عادت نہ
رکھے۔ رسول خدا کا دستور تھا کہ سفر سے تشریف لاتے، تو پہلے مسجد قبا میں
قیام فرماتے، اس کے بعد مکان میں تشریف لے جاتے اور فرمایا ہے کہ سفر
سے آکر یکایک مکان میں داخل نہ ہو جاؤ، ممکن ہے کہ تمہاری بیوی میلی کچیلی
گندی ہوں اور تم کو ان کی وہ حالت پسند نہ آئے۔ اس لئے ان کو صاف
کپڑا پہن لینے کا موقع دو۔ کسی مکان پر اجازت مانگی جائے اور اجازت
نہ ملے، تو رنجیدہ نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بہت سے ایسے مواقع ہوتے ہیں

کہ اجازت دینا بے موقع ہوتا ہے۔

گھوڑے کی سواری ہو یا موٹر کی بے تحاشا دوڑانا مصلحت عقل کے خلاف ہے۔ خاص خاص موقعوں پر مجبوراً اگر تیز چلنے پر انسان مجبور ہو تو اور چیز ہے، ورنہ تیز چلنا ہمیشہ نقصان دہ ہوتا ہے۔ ہر کام میں اعتدال ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ سواری کی تیزی سے وحشت، بے پروائی اور گھمنڈ ظاہر ہوتا ہے اور بسا اوقات اپنے لئے اور دوسروں کے لئے بھی خطرناک ہو جاتا ہے اور جان کاہ حادثات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

کھانے کے آداب

تھوڑی تھوڑی دیر پر کھانا معدے کو کمزور کرتا ہے۔ خون صالح نہیں بنتا، کیونکہ پورے ہضم کے بعد جو خون پیدا ہوتا ہے، وہ اچھا خون ہوتا ہے۔ ایک کھانا ہضم نہ ہوا، پھر کھا لیا، تو اس کا ہضم مکمل نہ ہو سکا۔ عموماً چھ گھنٹے کھانا کھانے کی عادت رکھنا چاہیئے باستثنائے شب، شب کو بارہ گھنٹے یا کم از کم دس گھنٹوں پر کھانا چاہیئے، یعنی عشاء کے وقت کھا کر سو جائے، تو پھر شب کو نہ کھائے اور نہ بچوں کو کچھ کھانے کو دے — علی الصباح اٹھ کر کھائے، صبح کو سویرے کچھ نہ کچھ کھا لینا ضروری ہے۔ کیونکہ بالعموم آٹھ دس گھنٹے کا فصل ہو جاتا ہے۔ معدہ خالی ہوتا ہے۔ خلوِ معدہ کی حالت میں کام کاج میں لگ جائے، اچھا نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ لکھنے پڑھنے کا کام بھی اچھا انجام نہیں پاتا۔

روکھی سوکھی غذا سے زیادہ قوت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ روغن دار غذا کے ہضم میں دیر ہوتی ہے اور تحقیق جدید کی رو سے روغن حیاتِ انسانی

میں زیادہ مفید نہیں۔ کیونکہ خون میں روغن کا جزو نہیں ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جسم میں کچھ چربی ضرور ہوتی ہے۔ تاکہ پٹھوں میں خشونت نہ ہو، نرمی قائم رہے اس طرح روغن نسوں کو زیادہ لچکدار بنائے رہتا ہے۔ بغیر اس کے سستی پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ روغن دار میوے ضرور مفید ہیں۔ کیونکہ ان میں بہتیرے غذائی اجزا موجود ہوتے ہیں۔ زیادہ گھی کا استعمال سوائے اس کے کہ آنتوں کو نرم رکھے، زیادہ مفید نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آنتوں کی نرمی سے اجابت صاف ہوتی رہے گی۔ اس طرح صحت کو مفید ہوگا۔ مگر گھی کی وجہ سے ریاح کے ہضم میں دشواری ہوتی ہے۔ روغنی روٹی اور پراٹھے سے سادی چپاتیاں زیادہ مفید صحت ہیں۔ چاول کو زیادہ صاف کر کے کھانا یا گیہوں کو چھانٹ کر اور باریک چھان کر کھانا نقصان پہنچاتا ہے کیونکہ چاول کے کُنڈے اور گیہوں کے چوکر میں وٹامن زیادہ ہے اوس کو نکال دینا نادانی ہے۔ اگر چاول اس طرح پکے کہ اس کا پانی (مانڈھ) پھینک نہ دیا جائے، تو زیادہ مفید ہے۔ اسی طرح بغیر چھانے ہوئے آٹے کی روٹی زیادہ مقوی ہے۔ ہماری صفائی اور نفاست ہماری بربادی کا موجب ہے۔ پھلوں کو زیادہ صفائی کے ساتھ چھیلنا بھی بُرا ہے سیب کا چھلکا تو آسانی سے کھایا نہیں جاتا، اس لئے چھیل کر کھانا پسند کرتے ہیں مگر امرود اور ناشپاتی وغیرہ چھیلنا مفید نہیں۔ اس زمانے میں چینی کی

پیداوار اس قدر زیادہ ہوتی ہے۔ پھر بھی مانگ پوری نہیں ہوتی کھائی اتنی جاتی ہے کہ ہضم نہیں ہوتی۔ اکثر اشخاص ایسے ملتے ہیں، جن کہ پیشاب سے شکر آتی ہے۔ جسم لاغر، طبیعت سُست، زندگی سے بیزار۔ نتیجہ ہے بد احتیاطی کا۔ ذائقہ تو میٹھا اچھا نکلا، لیکن صحت بگڑی۔

سب سے زیادہ صحت خراب کرنے والی چیز چائے اور زردہ تنباکو ہے۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے فائدہ کچھ نہیں اور نقصان زیادہ ہے۔ عادت لگ جانے پر چھوٹتی نہیں۔ اس لئے کوشش یہ کریں کہ اس کی عادت نہ لگے۔ لوگ خود زردہ، پان اور سگریٹ کے عادی ہوتے ہیں اور دوسروں کو منع کرتے ہیں۔ اس کا کوئی اثر نہیں۔ بہتر ہے کہ پہلے اپنی ایسی عادتوں کو چھوڑ دیا جائے، لڑکے خود بُرا سمجھنے لگیں گے۔ ماحول کا اثر بچّوں پر بہت پڑتا ہے اس لئے گھر کا ماحول ایسا رکھا جائے کہ بچّوں کو بُری عادتیں نہ لگیں۔

کھانے کی دعوتوں میں بہت پہلے نہ پہنچے اور نہ اس قدر دیر کرے کہ لوگ دسترخوان یا ٹیبل پر بیٹھ جائیں اور دسترخوان پر پہنچکر کھانے کی جلدی نہ کرے۔ اور جلد جلد لقمے نہ اٹھائے جائیں۔ اگر میزبان ہو تو جلد ابتدا کرے، تاکہ دوسروں کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ لقمہ احتیاط سے اٹھایا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ کپڑوں پر داغ آئے۔ ہاتھ بھی زیادہ گندہ نہ ہونے پائے۔ لقمے محض تین انگلیوں سے اٹھائے جائیں۔ انگوٹھا شہادت

انگلی اور بیچلی انگلی سے لقمہ اٹھایا جائے۔ ہتھیلی پر لقمہ کا داغ ہرگز نہ آئے۔ نادان انگلی بھر لقمہ اٹھاتے ہیں، یہ شائستگی کے خلاف ہے۔ لقمہ داخل کرتے وقت منہ زیادہ نہ کھولا جائے۔ تھوڑا سا لبوں کو کشادہ کر کے لقمہ منہ میں رکھ لیا جائے، منہ تیزی سے نہ چلایا جائے اور فرو حلق کرنے میں بظاہر زور لگایا جائے۔ لقمہ کو اچھی طرح دانتوں سے کچلنا چاہیئے۔ کم چبانے سے ہضم میں فتور پیدا ہوتا ہے۔ منہ چلاتے وقت آواز برآمد نہ ہونا چاہیئے۔ اس سے دوسروں کو کراہیت معلوم ہوتی ہے۔ کھانا شروع کرنے کے قبل تک اچھی طرح صاف کرلے۔ اگر اتفاقاً ضرورت پڑ جائے، تو اس طرح رومال سے ناک صاف کرلے کہ دوسروں کو خبر تک نہ ہو۔ کھاتے وقت دوسروں کی طرف زیادہ نہ دیکھے، بالخصوص دوسروں کے لقمے یا پلیٹ کی طرف نگاہ نہ ڈالے، کوئی بات کرنی ہو، تو چہرے کی طرف رخ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ بالکل رکابی کی طرف جھکا رہے۔ نہایت آرام اور انکساری کے ساتھ بیٹھے۔ اور اطمینان سے کھائے۔ کوئی چیز اگر زیادہ لذیذ ہو تو اس کی طرف نہ لپکے۔ بلکہ بے پروائی کے ساتھ تھوڑا سا لے۔ یہ نہ ہو کہ زیادہ کھا لینے کی خواہش کرے۔ ہاتھ بڑھا کر دور سے کوئی چیز نہ لے۔ ایک کٹورے کا چمچہ دوسرے کٹورے میں نہ ڈالے۔ بالخصوص شوربہ کا چمچہ دہی میں نہ لگائے۔ اگر یہ تشویش ہو کہ پہلے کس چیز سے شروع ہو تو، دوسروں کا انتظار کرے۔ کیونکہ طریقے الگ الگ ہیں۔

کہیں روٹی سے ابتدا ہوتی ہے، کہیں چاول سے۔ کہیں میٹھے سے۔ عرب میں بعض جگہ میٹھے سے ابتدا کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں شادیوں کے موقع پر بعض جگہ میٹھے سے ابتدا کی جاتی ہے۔ اور بالخصوص نوشہ کو پہلے میٹھا کھلایا جاتا ہے۔ لیکن بالعموم میٹھا بعد کو کھایا جاتا ہے۔ میٹھا کھانے میں انداز کرنا ہوگا کہ جو چیز کم میٹھی ہو، اس سے ابتدا کی جائے اور زیادہ میٹھی چیز پر اختتام۔ کیونکہ اگر زیادہ میٹھی چیز سے ابتدا کریں گے تو کم میٹھی چیز بالکل پھیکی معلوم ہوگی۔ دسترخوان پر پھل بھی ہوں، تو عموماً پھل بعد کو کھائے جاتے ہیں۔ لیکن میوہ تر کھانے کے بعد کھانے سے نقصان ہوتا ہے۔ میوہ تر جیسے تربوز یا اناناس وغیرہ۔ لیکن اناناس آخر میں کھائے۔ تربوز کو کبھی آخر میں نہیں کھایا جائے۔ میوہ کھانے کے فوراً، قبل یا میوہ تر کے فوراً بعد پانی نہیں پیا جائے۔

؎ میوہ بر آب و آب بر میوہ
عاقلاں را نباشد ایں شیوہ

زیادہ گرم کھانے کے بعد بہت سرد چیز مثل برف یا آئس کریم وغیرہ نہیں کھانا چاہیئے۔ تھوڑا وقفہ کرنا چاہیئے۔ شربت یا برف لگا سوڈا چائے کے فوراً قبل یا فوراً بعد نہ پیا جائے۔ ایک کو اختیار کرنا ہوگا تو دوسرے کو چھوڑ دینا ہوگا۔

اگر دوسروں سے قبل سیر ہو جائے، تو پہلے اُٹھ نہ جائے، تھوڑا کچھ کھاتا رہے۔ یہاں تک کہ دوسرے لوگ بھی ہاتھ موڑ لیں، تو ہاتھ موڑ لے۔ اور اگر سیر نہ ہوا ہو، اور دوسرے لوگ ہاتھ روک لیں، تو چاہیئے کہ ہاتھ روک لے، دیر تک بیٹھا کھاتا رہنا بدنما معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے رکابی پر کھانا تھوڑا ہی تھوڑا لے، تاکہ جب موقع ہو ہاتھ روک لے۔ رکابی پر جھوٹا چھوڑنا بھی اچھا نہیں ہے۔ مسنون ہے کہ رکابی صاف کر کے اُٹھے۔ ہاتھ دھونے میں سب سے سبقت نہ کرے اور سب کے سامنے خلال کر کے تھو تھو نہ کرنے لگے۔ اس سے دوسروں کو نفرت ہوتی ہے۔

آرائش

لڑکوں کو خود آرائی کا ذوق پیدا نہ ہونے دیا جائے۔ کیونکہ یہ شیوہ عورتوں کا ہے۔ لیکن عورتوں کو بھی اس کی طرف زیادہ متوجہ نہ ہونے دینا چاہیئے۔ عورتوں کو یہی چاہیئے کہ اپنے کو آراستہ کر کے شوہر کے سامنے جائیں۔ مجلس اور محفل کی شرکت کے لئے زیادہ آرائش زیبا نہیں لیکن محفل و مجلس میں شرکت کے لئے مرد ہو، یا عورت صاف ستھرے لباس ضروری ہے۔ کپڑے کی قلت ہو تو بھی کہیں جانا ہو تو اس کو دھو کر اور استری دے کر درست کر لیا جائے۔ بال سلجھا لیا جائے۔ ہاتھ منہ صاف کر لیا جائے۔ بٹن ڈھیلا ہو یا ٹوٹ گیا ہو، تو درست کر لیا جائے۔ گھر سے نکلنے کے پہلے جوتے کو پونچھ لیا جائے۔ بہتر ہے کہ روزانہ پالش بھی کر لیا کرے۔ ایک آئینہ اور ایک کنگھی رکھنا بہتر ہے۔ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم بھی باہر جاتے وقت داڑھیوں میں کنگھی کر لیتے تھے۔ آئینہ اگر نہ ہوتا، تو پانی میں چہرا دیکھ لیتے۔ دانتوں کو صاف رکھنے کی بڑی تاکید ہے۔ نہ ہو کہ کسی سے گفتگو کرتے وقت منہ سے بد بو آئے۔ اس لئے

مسواک کی بڑی تاکید ہے۔

لڑکوں کی بڑی آرائش یہ ہے کہ بچپن سے حکماء کے مقولے ضرب المثل محاورے اور نصیحت آمیز اشعار کچھ فلسفہ اور سائنس کی اصطلاحیں یاد کرادی جائیں۔ اور اچھے اچھے مقرروں کی کچھ تقریریں اور بعض افسانہ زبانی یاد کرا دینا بہتر ہے۔ ایسا لڑکا جس کو یہ چیزیں یاد ہوں گی، وہ ہر مجلس میں اپنا ایک خاص وقار قائم کر سکتا ہے اور بڑوں کے فقرے یاد رہنے سے گفتگو میں اس کے رٹے فقرے بھی عالمانہ اور حکیمانہ انداز کے ہوں گے۔ واہی تباہی بکنے کا عادی نہ ہوگا۔ کسی جگہ بیٹھ کر بہت بولنے سے بھی عزت نہیں ہوتی اور نہ بالکل خموش رہنا دوسروں پر کوئی اثر ڈالتا ہے۔ لیکن خموشی سے اتنا ہلکا نہیں ہوتا، جتنا زیادہ بولنے سے۔ معلومات کا یہ تقاضہ نہیں کہ ایک مجلس میں پورے کا پورا خزانہ انڈیل دیا جائے۔ یا ایسا معلوم ہو کہ اپنی پوری معلومات کا رعب گانٹھنا مقصود ہے۔ علم کا منشا یہ ہے کہ بوقت ضرورت اس کا اظہار کیا جائے۔ بالخصوص جہاں لوگوں کو صحیح رائے قائم کرنے میں دقت ہو رہی ہو، وہاں اپنے معلومات سے مدد پہنچا دینا مفید اور بامحل ہوتا ہے۔

بچوں کو چھوٹے بڑے کی تمیز اور بمطابقت مرتبت، اُن سے کلام کرنا اور اس کے ساتھ مناسب سلوک برتنا، اچھے لوگوں کی نگاہ میں عزیز تر

بنا بھی دیتا ہے۔ علم اور شائستگی کا تقاضہ ہے کہ کسی سے اُلجھ کر گفتگو نہ کی جائے غصہ اور مخالفت میں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں، جو مخاطب کی شان کے خلاف نہ سمجھے جائیں۔ اور وہ خود اس کو اپنی ذلت و ہتک سمجھے۔ اختلاف رائے اور شئے ہے اور تذلیل و اہانت اور۔ ذلیل سے ذلیل آدمی بھی نہیں پسند کرتا کہ کوئی اس کی اہانت کرے۔ ہر شخص ایک خودداری کا مالک ہے۔ وہ اس کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا ہے۔ اور جہاں اس کی خودداری میں ٹھیس لگتی ہے۔ جذبہ انتقام سے اُبھر پڑتا ہے۔ اس لئے چاہیئے کہ اپنے غلام کو بھی سخت الفاظ میں زجر و توبیخ نہ کرے۔ ڈانٹ ڈپٹ روا نہ رکھے کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ حقیر سے حقیر انسان جیسے کا تیسا جواب دینے لگتا ہے، جو ایک باوقار انسان کے لئے بڑی اہانت ہے۔ اس لئے غلیظ میں ڈھیلا نہ پھینکے کہ چھینٹ پڑنے کا احتمال ہے۔

کسی کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھانا اسی، وقت روا ہے کہ جب اپنی جان کا خطرہ ہو۔ ایک مرد کسی کو مارے تو ایسا مارے کہ مار ڈالے، ورنہ تھپڑ پٹڑ مُکّا، گھونسہ چلانا، شریف بچوں اور شیر دل انسان کا کام نہیں۔ یہ پستیٔ خیال اور دنائت کی علامت ہے۔ مناسب ہے کہ خصائل قبیحہ سے مصفّا اور فضائل حسنہ سے مرصّع کردے کہ اپنی اولاد کو دیکھ دل ہی دل میں خود خوش ہو، جو دیکھے وہ داد دے۔

حقوق والدین

ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے۔ کوئی تصور کرے اس کو کس قدر کسل اور گرانی برداشت کرنی ہوتی ہے۔ سینکڑوں چیزوں سے پرہیز کرنا ہوتا ہے کہ بچے کو نقصان نہ ہو۔ اٹھنا، بیٹھنا، سونا جاگنا، کھانا پینا، سب دشوار ہو جاتا ہے۔ پیٹ کی بے کلی سے راتوں کو اٹھ کر ٹہلتی اور کبھی غشی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، تو ہفتوں نفیس سے نفیس غذائیں پسند نہیں آتی۔ کھا لیا تو قے ہو گئی۔ بڑی بڑی مشقتوں اور تکلیفوں کے بعد تولد ہوئے، تو دو تین سال تک غلیظوں میں اٹے لپے۔ آپ کو نہ بول کی تمیز نہ براز کی۔ صاف صاف کپڑا پہن کر بیٹھے۔ آپ نے اس کو آلودہ کر دیا۔ کچھ جھنجھلائی، کچھ بگڑی، لیکن پھر سینے سے لگا لیا۔ راتوں کو کبھی منہ پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کروٹ بدل بدل کر نہ سوئی کہ آپ رو اٹھیں گے۔ کچھ بڑے ہوئے، تو ہر وقت کی دیکھ بھال۔ دھوپ میں نہ کھیل رہے ہوں، کسی بچے سے جھگڑا نہ ہو جائے۔ کہیں پھسل نہ پڑیں۔ ہر ہر لمحہ کی دیکھ بھال کے بعد خدا خدا کر کے جوان ہوئے۔ بڑے

حوصلے سے جوڑا ڈھونڈھا۔ اپنی سمجھ میں جہاں تک اچھی سے اچھی ممکن ہو سکتی ہے، عورت منتخب کر کے اس کا جوڑ لگا۔ گیت گائے، مبارکبادیاں سنیں۔ عزیز و اقربا کی دعوتیں کیں۔ قرض کیا، وام لیا، تقاضے سنے۔ طعنے سہے۔ کیا وہ ماں اس لائق ہے کہ بیوی کے ہر اشارے پر اس سے الجھ پڑا جائے۔ یا وہ مصیبتوں کے دن کاٹے اور آپ عیش کی زندگی گذاریں انسانیت کے خلاف ہے کہ ایسے محسن کا احسان بھول جائے۔

باپ نے پیٹ میں رکھنے کی زحمت تو نہیں برداشت کی۔ لیکن جب سے یہ خبر ہوئی کہ صاحبزادے تشریف لانے والے ہیں۔ بیوی کو ہر مشقت اور تکلیف کے کاموں سے بچایا۔ ان کی ضرورت کی ہر چیز مہیا کی، تاکہ ان کو رنج نہ ہو، ان کو تکلیف نہ ہو، دل میں ملال نہ آئے۔ نہ کھانے کی فرمائش، نہ ناشتہ کے۔ اپنی ضرورت میں کبھی نہ لگایا۔ سر میں درد ہوا بدن کسل رہا۔ لیکن بیوی سے کوئی استعانت نہ چاہی، کیونکہ وہ خود پریشان زچگی کے دنوں کی ضروریات کا مہیا کرنا محنت و مشقت کر کے قرض ادھار کر کے سب چیزیں بہم پہنچائیں۔ راتوں کو جب روئے، تو کبھی ماں نے بہلایا اور کبھی باپ نے اور تعلیم و تربیت میں تو باپ کی کوشش اور توجہ کی زیادہ ضرورت پڑی۔ اس لئے ماں باپ دونوں کے حقوق اولاد کے سر پر ہے اور کسی قیمت میں بھی اس سے سبکدوشی نہیں ہو سکتی۔

خدائے پاک نے قرآن میں دونوں کی اطاعت اور خدمت کا حکم فرمایا ہے بلکہ اپنی عبادت کے بعد کسی کی خدمت اور فرماں برداری واجب کی ہے، تو ماں باپ کی۔ ماں اور باپ کے حقوق کی مثال میں حکماء نے بتایا ہے کہ خدمت ماں کی زیادہ تر جسمانی ہے۔ اس لئے ماں کے حقوق زیادہ جسمانی ہیں اور باپ کی خدمت زیادہ تر روحانی۔ اس لئے زیادہ تر حقوق روحانی ہیں۔ بہرحال دونوں کی خوشنودی مقصود ہونا چاہیئے۔

ماں باپ کی اطاعت اور موافقت تین طرح ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی سچی ہمدردی کرے اور ان کو خوش رکھنے میں مستعدی قائم رکھے قول اور عمل دونوں طریقوں سے ان کو راضی رکھے۔ باتیں نرم کرے۔ اُن سے کبھی حجت اور بحث نہ کرے۔ ان کی بات نہ کاٹے۔ اپنے آپ کو اُن سے زیادہ دانش مند ثابت کرنے کی کوشش نہ کرے۔ کیونکہ اگرچہ ماں باپ کی عقل اور دانش کم ہو۔ لیکن اولاد کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کی عقل اور دانش، ماں باپ کی عقل و دانش کا نتیجہ فکر اور عمل ہے۔ اگر وہ مواقع پیدا نہ کرتے تو اولاد کو عقل و دانش ہونا محال ہوتا۔ اگر اس کے قوئ فطری کی حفاظت نہ کرتے، تو اولاد کی آنکھ کی روشنی زائل ہو جاتی دماغ پر ضرب و الم کا اثر پڑتا اوس کی قوت بھی زائل ہو جاتی، جیسا کہ دیکھا گیا ہے بعض بیماری کا صحیح طور پر علاج نہ کرنے سے دماغ میں فتور پیدا

ہو جاتا ہے۔ قوی فطری کی حفاظت کا نتیجہ ہے کہ اولاد عاقل اور دانشمند ہو جاتی ہے اور فنون و حکمت کی ماہر۔

دوسری بات یہ ہے کہ ضرورت دنیاوی میں ان کی پوری مدد کرے ایک دن یہ تھا کہ اولاد کوشش عمل سے مجبور اور احساس ضرورت سے معذور تھی، تو ماں باپ بغیر اس کی استدعار اور طلب کے ساری ضروری چیزیں مہیا کرتے رہے۔ اسی طرح جب والدین بہ تقاضائے بشر ضعیف اور مجبور ہو جائیں، تو اولاد کا فرض ہے کہ ان کی ضرورتوں کو بلا استدعاء و طلب بہم پہنچاتے رہیں۔

تیسری بات یہ کہ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہر جگہ پر اظہار خیر خواہی کرے تاکہ ماں باپ کا دل بھی خوش ہو اور دوسرے لوگوں کو اس کی سخاوت کا اعتراف ہو۔ اور ان کی نصیحت اور وصیت پر توجہ سے عمل کرے ان کی محبت اور شفقت کا اعتراف کرے۔ یہاں تک کہ ان کے مرنے کے بعد بھی جن چیزوں سے منع کیا ہے۔ باز رہے اور جس کام کی تاکید کی اُس سے غفلت نہ برتے، تاکہ دین و دنیا کی فلاح کا مستحق ہو۔

ماں باپ کی نافرمانی بھی تین طرح سے ہوتی ہے۔ اول ان کو ایذا دے کر، دوسرے ان کو ضرورت کے پورا کرنے میں بخل کر کے۔ تیسرے انکی اہانت کر کے۔ حدیث شریف ہے کہ جو انسان کا شکر گذار نہیں ہوتا خدا

کا کبھی شکر گذار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس کا احسان نمایاں ہوتا ہے۔ جس کا علم اور جس کی واقفیت درجہ یقین کو پہنچتی ہے۔ خدا کے احسانات کا ادراک مشکل سے ہوتا ہے۔ اس میں غور و خوض کرنا ہوتا ہے۔ اس پر بھی انسانی دماغ اکثر قاصر رہتا ہے۔ دور حاضر میں اس قدر علم و دانش کی ترقی ہے۔ لیکن کروڑوں انسان ایسے ہیں، جو خدا کے سرے سے قائل ہی نہیں۔

ماں باپ کی نافرمانی کرنے والی اولاد لائق انتہا تاسف ہے کیونکہ خسر الدنیا والآخرۃ کی مصداق ہے۔ سو نہ دین کی فلاح کی امید نہ دنیا کی۔ دنیا میں مال و دولت ممکن ہے، ہو جائے۔ لیکن سمجھدار انسان کے دل میں وقعت نہیں ہوتی۔ دلی مسرت سے محروم رہتا ہے اور آئے دن ایسی مصیبتیں سر پر آتی رہتی ہیں کہ خدا کی پناہ افسوس ہے کہ انسان غیظ و غضب خود غرضی اور سرکشی میں اپنے بھلے برے کی تمیز نہیں کرتا۔ اور ماں باپ ایسے محسنین اور بہی خواہ کو ناخوش کرتا ہے۔ اَللّٰھُمَّ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ المُسْتَقِیْم۔

نوکر چاکر

نوکر غلام، یا لونڈی، جو خانہ داری کے امور میں ہاتھ بٹائے، اس کی مثال اعضاء کی سی ہے۔ اگر ہاتھ کا کام کرے، تو گویا ہاتھ۔ پاؤں کام کرے، تو پاؤں، آنکھ کا کام کرے، تو آنکھ۔ قلب و دماغ کا کام انجام دے، تو قلب و دماغ کے مقابل ہے۔ نوکر کبھی کوئی بوجھ اٹھا کر رکھتا ہے، کبھی کہیں سے جا کر لے آتا ہے، کبھی بیٹھا بیٹھا چیزوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کبھی سوچ سمجھ کر آقا کے نفع یا آرام کا کام انجام دیتا ہے۔ پیش بینی کرتا ہے۔ اسی طرح ہر عضو کی خدمت نوکر سے انجام پاتی ہے۔ جو جیسا کام کرتا ہے، ویسا ہی عزیز تر اور محبوب تر ہوتا ہے۔ وہ جو آقا کی راحت و آرام کی فکر و پیش بینی کرتے ہیں۔ ماں باپ اور سچے دوست کے برابر ہیں۔ ان کی قدر زیادہ کرنی چاہیئے۔ لیکن ادنیٰ درجہ ملازمت کا یہ ہے کہ حکم حسب منشا بجا لائے، جو اتنا کرلے وہ جو کچھ طلب کرے، اس کا مستحق ہے۔

بعض نوکر اشارہ سے آقا کا مقصد سمجھ جاتے ہیں اور طبع شریف

ہوتے ہیں، اولاد کی طرح ان کی تربیت کرنی چاہیئے۔ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ مشکل سے منشاء سمجھتے ہیں اور کبھی کبھی بہت سمجھانے پر بھی کام بگاڑ دیتے ہیں۔ ان کو جانور سمجھنا چاہیئے کہ نکیل پکڑ کر گھمانے سے وہ راستہ پر آسکتے ہیں، جن چیزوں کی ان کو زیادہ ضرورت ہو وہ مہیا کرنا چاہیئے تاکہ بیزار ہو کر رخصت نہ ہو جائے اور جو خلوص و محبت اور بہتری کے ساتھ راحت رسانی میں مشغول رہیں، ان کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ضرورت آنے کے پہلے ان کی ضرورت کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔

واضح رہے کہ نوکر چاکر بھی خدائی نعمت ہے۔ اللہ ہی کے خاص مہر و کرم سے حسب خواہ نوکر ملتے ہیں۔ اس لئے اچھے مل جائیں، تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے، اور نہ ملیں، تو دعا کرنی چاہیئے کہ اپنی نعمتوں ہی سے یہ نعمت کہ خانہ داری کے لئے ناگزیر ہے۔ عطا فرمائے۔ چونکہ آرام و راحت کے لئے نوکر چاکر ضرور ہیں۔ اس لئے ان کی مزاج داری اور دلجوئی کرنا بھی بہت ضروری ہے۔ ناسمجھ نوکر لیکن کسی طرح کا کام دیدے، تو اس کا وجود عدم سے کہیں بہتر ہے۔ میرے ایک دوست نے کہا کہ تمہارا نوکر بہت بدعقل ہے۔ میں نے کہا کہ اگر بدعقل نہ ہوتا تو میری غلامی کیوں کرتا، کوئی صنعت و حرفت سیکھتا مجھ سے زیادہ دولتمند کے ہاں اس کو آرام زیادہ ہوتا۔ میری غرض یہ ہے کہ نوکروں

سے یہ توقع رکھنا کہ بہت سمجھدار ہوگا۔ بالکل غلط۔ کیونکہ واقعی انسان اپنی نوعی شرافت اور کرامت کے باوجود غلامی تک اُس وقت اتر سکتا ہے جب اس کی عقل و دانش میں نقصان ہو۔ ورنہ ایک عقلمند آدمی دنیا میں کیا کچھ نہیں کر گذرتے ہیں۔

زیادہ ہشیار نوکر سے ہشیار بھی رہنا چاہیئے۔ کیونکہ ایسے نوکر اکثر خطرناک ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب ان کو کسی وجہ سے بے دلی ہو جاتی ہے، تو مال کے علاوہ جان کا نقصان پہنچانے میں دریغ نہیں کرتے۔ ظاہر ہے کہ جو عافیت آرام اور نفع پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ نقصان اور مضرت بھی پہنچا سکتا ہے۔ اس لئے ایسے نوکروں سے جہاں تک اچھا سلوک کر سکے، یعنی ان کو راضی اور خوش رکھ سکے، کرتا رہے اور جب اس امر کا شبہہ ہو کہ اس کے دل میں ناراضی پیدا ہو گئی ہے۔ فوراً علحدہ کر دے، اس کا موقع نہ دے کہ وہ نقصان پہنچا سکے۔

لنگڑے، لُولے، مجذوم یا مبروص نوکر سے اجتناب کرے۔ کیونکہ ان سے اکثر نقصان پہنچتا ہے اور حسب خواہ خدمت انجام نہیں پا سکتی ہے۔ صورت شکل کا بھی اعتبار ہوتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ جو صورتاً اچھا ہوتا ہے، سیرتاً بھی اچھا ہوتا ہے۔ لیکن کوئی کلیہ ایسا نہیں، جس میں استثناء نہ ہو۔ اس کے خلاف بھی دیکھا گیا ہے۔ بالخصوص خوبصورت

عورتوں کو خواہ وہ لونڈیاں ہوں یا بیبیاں، بدمزاج اور تند خو پایا گیا ہے۔ نوکر ہو یا دائی جس کو حیا اور دیانت ہو، قابل قدر ہو۔ کیونکہ حیا سینکڑوں عیوب سے بچاتی ہے۔ اور دیانت تمام نیک نامی کی جڑ ہے۔

نوکر کو وہی کام دے، جس کا وہ ماہر ہو۔ جس کو کھانا پکانے کی مہارت ہے۔ مویشیوں کی نگرانی سپرد نہ کرے اور نہ اس کے خلاف اور ایک کام کو چھوڑ کر دوسرا اور دوسرا چھوڑ کر تیسرا نہ دے۔ اس طرح کسی کام کو بخوبی انجام نہ دے سکے گا۔ جس کام میں اس کو رغبت ہو، اس میں لگانا چاہیے۔ کیونکہ ہر کام ایک آدمی نہیں کر سکتا ہے اور جو کام طبیعت کے موافق ہو، وہی بہتر انجام دے سکتا ہے۔

نوکر کو آقا کی چیزوں سے اس وقت محبت ہو سکتی ہے۔ جب اس کو امید ہو کہ اس سے اس کو خود بھی منفعت حاصل ہو گی، اس لئے ایسا نہ کرے، کہ کسی نعمت سے اس کو بالکل محروم کر دے۔ بالخصوص جب کھانے پینے کی کوئی چیز ہو، جو زیادہ لذیذ اور پسندیدہ ہو، اس سے خادم کو محروم نہ کرے، کیونکہ ہر آدمی اچھی چیز سے رغبت رکھتا ہے۔ بعض گھروں کا دستور ہے کہ خود اچھا کھاتے اور ملازم کو کمتر درجہ کی غذا دیتے ہیں۔ یہ کم ہمتی ہے۔ اصل رزاق خداوند کریم ہے۔ نعمتوں کا مصدر اس کی کرامت و انجام کو سمجھنا چاہیئے۔ اور چاہیئے کہ خدا کے

کم بضاعت بندوں کو اس کی نعمت سے محروم نہ کرے۔ سوائے محض ایسی چیزوں کے، جو کسی علت یا ضرورت کی وجہ سے استعمال کرتا ہو، جیسے کمزوری کی وجہ سے مقویات استعمال کرتا ہو۔ یا محض ایسی چیز میں سب کو شریک کرنے سے استطاعت سے زیادہ صرفہ ہو جانے کا احتمال جو برداشت نہ ہو سکے، تو ہمیشہ نہیں گاہے گاہے شریک کرے۔

سونے بیٹھنے کی جگہ سردی گرمی سے محفوظ رہنے کا انتظام، جس طرح گھر اور افراد کے لئے کیا جائے۔ خادم کے لئے بھی کرنا ضرور ہے۔ جیسے موسم کے مطابقت، سونے بیٹھنے کی جگہ اور تخلیہ کا مقام۔ بیوی بچوں کے لئے اگر لحاف کا سامان کرے، تو نوکر کے لئے کمبل ضرور مہیا کرے اگر یہ چاہے کہ نوکر جاڑوں میں سویرے اُٹھ کر کام پر مستعد ہو جائے، تو گرم کوٹ یا چادر ضرور دے۔ اگر چاہے کہ گرمی میں نوکر دوپہر کو پنکھا کھینچا کرے تو اس کے لئے دھوپ اور لُو سے محفوظ جگہ بنائے، جہاں وہ بیٹھ کر پنکھا چلائے۔ غرض یہ کہ اس کی عافیت کا خیال رکھنا ضرور ہے۔

نوکر دائی سے بے رخی سے گفتگو نہ کرے۔ اس سے بیدلی ہوگی انسان کو کتنا ہی آرام و راحت کا سامان ملے، لیکن اگر گھر والوں سے محبت کے برتاؤ کی امید نہ ہو اور ہر شخص اس سے نفرت اور بے رُخی دکھائے، تو اس گھر میں اس کا جی نہیں لگ سکتا، جنت بھی ہو تو دوزخ معلوم ہو گی

یہ امر مسلم ہے کہ موجودہ دور میں کوئی انسان کسی کے خوف سے کام نہیں کر سکتا۔ بلکہ کسی دور میں خوف سے کبھی محبت نہ برتی گئی۔ بالخصوص آج کل مساوات کا دور ہے۔ کوئی شخص بدسلوکی برداشت نہیں کر سکتا۔ امریکہ میں ملازمت، ملازمت نہیں سمجھی جاتی، بلکہ مشارکت سمجھی جاتی ہے۔ ایک شخص مکان صاف کرتا ہے۔ مالک مکان اس کو پیسہ دیتا ہے۔ دونوں کا مقابلہ ہے۔ ایک جسمانی خدمت کرتا ہے، دوسرا مالی۔ ملازمت نہیں۔ معاہدہ مشارکت ہے۔ معاملہ صاف ہے۔ میں تمہاری یہ خدمت کروں گا، تم اس کے معاوضہ میں فلاں خدمت انجام دے دو۔

اسلامی تعلیم بھی یہی ہے کہ غلام جو جنگ میں گرفتار کرکے لائے جاتے تھے۔ اس سے برا سلوک کرنا ناروا تھا۔ ایک دفعہ حضرت عمر حضرت انس کو اس جرم میں دُرّے لگا دیئے کہ وہ اپنے غلام سے اس کی صلاحیت سے زیادہ سخت کام لے رہے تھے۔ رسول پاک نے فرمایا ہے کہ جیسا کھاؤ غلام کو ویسا ہی کھلاؤ اور جیسا پہنو، ویسا ہی پہناؤ، حالانکہ وہ قیدی تھے اور ہمارے یہاں تو ملازم ہمارے جیسے آزاد ہوتے ہیں۔

میں نے سفر حج میں ایک شب اپنے معلّم عبدالرحمٰن مجبوب کو دیکھا کہ وہ سونے کی جگہ تلاش کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کا بستر تو آپ کے خیمہ میں ہے، وہاں آپ کو سوتے نہیں دیکھا ہے۔ بولے ہاں وہاں عبداللہ

سو گیا ہے عبداللہ وہ غلام تھا جسکو انہوں نے اس سفر میں جدہ میں سات روپیہ میں خریدا گیا تھا۔ عبدالرحمٰن مجبوب ہمارے معلّموں میں سخت مزاج اور غصہ ور سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں دستور ہے کہ مالک کے بستر پر غلام سو جائے، تو اسکو بیدار نہیں کیا جا سکتا۔ (میں نے بہار میں دیکھا کہ شوہر کے بستر پر بیوی سو گئی، تو شوہر نے اس طرح ٹھیل دیا کہ وہ زمین پر گر گئی۔ اور فرمایا "یہ نوابی! میرے بستر پر لیٹی ہو کر سو گئیں" مجھ کو آج تک یہ فلسفہ میں سمجھ میں نہ آیا، لیکن ہے یہ واقعہ)

نوکر کے دل میں یہ اثر پیدا کرنا چاہیئے کہ اگر اس گھر سے علیحدگی اختیار کی تو دوسری جگہ یہ عافیت حاصل نہ ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ یہ کہ یہ جگہ مستقل رہنے کے لائق ہے، نہ کہ اس کے دل میں اندیشہ ہو کہ مالک میرا ند و دریغ ہے جب چاہے گا فوراً نکال دیگا۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کو مسافر خانہ تصور کرے گا اس کی فلاح و بہبود سے دلچسپی نہ رکھے گا۔ یہ عادت نہ ہونی چاہیئے کہ ہر بات پر ناراض ہو جائے اور برابر دھمکی دی جائے کہ یہ ناکارہ ہے اس کو نکال دوں گا نکالنے کے لائق ہو تو نکال دیں، لیکن یہ کبھی نہ کہے کہ نکال دوں گا۔ کیونکہ بیدل نوکر دشمن کے برابر ہوتا ہے۔

نوکر کے آرام کا وقت بھی مقرر کر دینا لازم ہے تاکہ جبتک کام کرے ہمت اور محنت سے کرے اور آرام کی توقع رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ بےوقت کام لیا جائے اور اس کی راحت و آرام کا خیال نہ کرے۔ مگر ایسا بھی نہ ہو کہ کبھی سختی نہ کرے۔ غلطی اور قصور

کے تحت تنبیہہ، جرمانہ، یا سزا بھی کرے تاکہ اصلاح ہو محض انتقام مقصود نہ ہو۔ اور قصور معاف بھی کر دینا چاہیئے، تاکہ آقا کو بیرحم نہ سمجھے۔

مختلف ممالک کے باشندوں کا خاصہ اور مزاج مختلف ہے۔ عرب والے بات چیت میں بہت تیز اور گفتگو میں فصیح و بلیغ ہوتے ہیں لیکن بدمزاجی اور خود غرضی میں بدنام ہیں۔ فارس والے عقل و ذہانت، دوراندیشی وغیرہ میں مشہور ہیں۔ فریب و حرص میں بدنام۔ روم والے وفاداری، ذہانت اور کفایت شعاری میں مشہور ہیں مگر بخل میں بدنام۔ ہندوستانی تیز فہم اور حسن میں مشہور ہیں، مگر خود پسند ہیں۔ مکر اور بدنیتی میں بدنام۔ ترک دلیری، خدمت گزاری اور خوبصورتی میں مشہور ہیں۔ مگر بغاوت اور سرکشی سخت دلی اور بیحیائی میں بدنام۔ نیپالی، فرماں بردار ہوتے ہیں لیکن بزدل ہیں۔ میں نے چند نیپالیوں اور چند پنجابیوں کو پہرہ کے لئے ایک جنگل میں مقرر کیا، لیکن اتفاق سے ایک کان پر دو نیپالی اور دو پنجابی کو متعین کرنے کی ضرورت پڑی۔ پنجابیوں کو دیکھ کر نیپالی بھاگ کھڑے ہوئے اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔

مختلف مزاج ملازمین سے کام میں بڑی ہوشیاری اور مردم شناسی کی ضرورت ہے۔ بہرحال آقا کو متحمل مزاج اور دور اندیش ہونا چاہیئے۔ جلد اُلجھ پڑنے کی عادت رکھنے والے لوگ اچھے ملازم سے کام نہیں لے سکتے۔ امر مسلم ہے کہ ہم کسی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے جبتک ہم خود دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔

تمام

مصنف کی دوسری کتابیں

۱ ایران کی مختصر تاریخ
(انگریزی میں) ۲ روپیہ ۵۰ پیسے

۲ روحانی دنیا
۱ روپیہ

۳ بانگ درون
(منتخب کلام) ۲ روپیہ